سیرۃ النبیؐ

رسول اللہ صلعم کے حالات وغزوات، اخلاق وعادات اور تعلیم وارشاد کا یہ عظیم الشان کتابی ذخیرہ جس کا نام **سیرۃ النبیؐ** عام طور سے مشہور ہے، مسلمانون کے موجودہ ضروریات کو سامنے رکھکر صحت واہتمام کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے،

ابتک اس کتاب کے پانچ حصے شائع ہو چکے ہین، پہلے مین ولادت سے لیکر فتح مکہ تک کے حالات اور غزوات ہین، اور ابتدا مین ایک نہایت مفصل مقدمہ لکھا گیا ہے جسمین فن سیرت کی تنقید وتاریخ ہے، دوسرے حصہ مین تکمیل دین، تاسیس حکومت الٰہی، وفات، اخلاق وعادات، اعمال وعبادات اور اہلبیت کرام کے سوانح کا مفصل بیان ہے، تیسرے حصہ مین آپ کے معجزات وخصائص نبوت پر بحث ہے جسمین سب سے پہلے عقلی حیثیت سے معجزات پر متعدد اصولی بحثین کیگئی ہین، پھر ان معجزات کی تفصیل ہے جو بروایات صحیحہ ثابت ہین، اسکے بعد ان معجزات کے متعلق غلط روایات کی تنقید وتفصیل کیگئی ہے، چوتھے حصہ مین ان اسلامی عقائد کی تشریح ہے جو آپ کے ذریعہ مسلمانون کو تعلیم کئے گئے ہین، کوشش کی گئی ہے کہ اس مین قرآن پاک اور احادیث صحیحہ سے اسلام کے عقائد لکھے جائین، پانچویں حصہ مین عبادت کی حقیقت، عبادات کی تفصیل وتشریح اور ان کے مصالح وحکم کا بیان ہے اور دوسرے مذاہب کے عبادات سے ان کا مقابلہ وموازنہ ہے، چھٹے حصہ میں حقوق، فضائل اور آداب کے عنوانون اور انکی ذیلی سرخیوں کے تحت اخلاقی تعلیمات کی تفصیل ہے، حجم ۶۱۱ صفحے قیمت قسم اول صہ قسم دوم للعہ

قیمت باختلاف کاغذ حصہ اول تقطیع خورد للعہ، حصہ دوم تقطیع کلاں ؎ تقطیع خورد صہ و؎ حصہ سوم تقطیع کلاں ؎ وللعہ تقطیع خورد معہ وصہ حصہ چہارم تقطیع کلاں عہ و؎ تقطیع خورد معہ صہ حصہ پنجم تقطیع کلاں صہ وللعہ،

(منیجر دار المصنفین اعظم گڈہ)

جلد ۴۴	ماہ جمادی الاول ۱۳۵۸ھ مطابق ماہ جولائی ۱۹۳۹ء	عدد ۱

مضامین

تاریخ اخلاق اسلامی (حصہ اول)

جسمیں اولاً بعثت نبوی سے پہلے اہل عرب کے اخلاق کی تفصیل کی گئی ہے، اس کے بعد دور نبوت میں اسلامی اخلاق کی پوری تاریخ، ان کے اسباب ومحرکات، ان کے انواع واصناف اور ان کی عملی تشکیل وتکمیل کے تمام مظاہر قرآن وحدیث سے اخذ کرکے بیان کئے گئے ہیں،

قیمت: ؎ حجم ۲۷۴ صفحات،

"منیجر"

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

مئی اور جون ۳۹ء کے معارف مین "بعض پرانے نقطون کی نئی تحقیق" اور "تنبیہ" پر جو دو مضمون نکلے ہین بحمد اللہ کہ انھون نے اہل علم کی نظر مین اعتبار پایا، نواب صدر یار جنگ مولنا شروانی اور ڈاکٹر عبد الستار صدیقی نے اپنے کرم نامون مین اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا ہے، اور ڈاکٹر صاحب نے مزید کرم یہ کیا ہے، کہ استدراک کے طور پر پہلے مضمون پر بہت کچھ اضافہ کیا ہے، یہ تحریرین اگلے معارف مین ناظرین کے سامنے آئینگی،

سیرۃ النبی کی چھٹی جلد پر جو ابھی نکلی ہے جن دوستون نے اظہار خیال کیا ہے، ان مین سے سب اہم ہمارے دوست مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی کا بیان ہے، وہ ایک خط مین لکھتے ہین کہ "اسلام کے فلسفۂ اخلاق پر اتنا جامع بیان، اردو کیا عربی مین بھی نہین"، اسی لئے موصوف نے یہ ارادہ کیا ہے کہ سیرت کی اس جلد پر ایک تبصرہ لکھکر تالیف اور مؤلف دونون کو ممنون کرین، خدا کرے یہ وعدہ جلد وفا ہو تاکہ غالب کی طرح ہمین اپنے جینے کو اس کی بے اعتباری کی دلیل نہ ٹھہرانی پڑے،

لکھنؤ مین شیعہ سنی بحث نے جو خطرناک صورتِ حال پیدا کی ہے اس پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے، لکھنؤ شیعہ اصحاب کی راجدھانی تھی، وہان صدیون سے علانیہ مدحِ صحابہ جرم تھی، اور یہ جرم وراثۃً حکومت برطانیہ کے عہد تک ممنوع ہوتا چلا آتا رہا، سنیون نے غالباً ۱۹۰۵ء سے اس کے خلاف احتجاج شروع کیا اور آخر چونتیس پینتیس برس کی جد وجہد کے بعد اب کامیاب ہوئے، اور اتنا حق ملا کہ سال مین ایک دن وہ علانیہ مدحِ صحابہ کر سکین، گو کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی بر سر بازار مدح

مدح خوانی اور اس کے لئے سڑکون اور بازارون مین جلوس نکالنا بدعات مین ایک اور نئی بدعت کا اضافہ ہے، تاہم ہم اس لئے اس کی مخالفت نہین کرتے کہ پچھلی شیعہ حکومت کے ایک ناجائز اور ظالمانہ سرکاری حکم کا منسوخ ہونا شیعہ سنی اتحاد کی راہ کے عوائق و موانع کو کم کرنا ہے کیونکہ اباحت پر قدغن لگا کر اس کو فقہا کی نظر مین واجب العمل بنا دیا گیا تھا۔

شیعہ اصحاب نے اس کے جواب مین "تبرا" کی دل آزار تحریک جاری کر رکھی ہے، اور لطف یہ کہ اس کی اتنی عظمت بڑھائی ہے کہ اس کو کلام الٰہی کا ہم پایہ بنایا ہے، یعنی وہ تبرا نہین کہتے، بلکہ تبرا **شریف کی تلاوت** کرتے ہین، اس کے جواز کا استدلال ان آیتون سے ہے جن مین اللہ تعالیٰ نے کفار پر لعنت فرمائی ہے، لیکن شاید سارے احکام الٰہی مین یہی ایک حکم ہے (اگر یہ حکم ہے) جس پر سادات بنی فاطمہ رضی اللہ عنہم سے پہلے سلاطین بنی امیہ نے عمل کیا، اور شیعون مین سلاطین آل بویہ دیلمی نے اپنے عہد مین ان کی تقلید کی، کیا عجیب بات ہے کہ آج محبانِ اہلبیت کرام کو سنتِ اہلبیت کی پیروی پر نہین، بلکہ دشمنانِ اہلبیت کی پیروی پر اصرار ہے! کیا اچھا ہو اگر دونون گروہ اپنی اپنی بدعتون سے از خود احتراز کرین، اور ہر قسم کے ایسے جلسون اور جلوسون کو یک قلم موقوف کر دین جن کی اصل شریعتِ محمدیہ مین نہین، کہ یہ اختلاف فی الدین نہین، اختلاف فی البدعات ہے،

مسلمان اخبارون مین اسلام اور مسلمانون کی حفاظت کی غرض سے ہندوستان مین اسلامی تمدنی دائرے (اسلامک کلچرل زون) قائم کئے جانے کی تحریک جاری ہے، ہم نے اب تک اس کو اس قابل بھی نہین سمجھا تھا کہ اس پر اظہارِ خیال کیا جائے، مگر دیکھا جا رہا ہے کہ اس دائرہ کے تمام نقطون پر غور کئے بغیر اس کو واقعی اسلام اور مسلمانون کی حفاظت کا تعویذ سمجھا جا رہا ہے، حالانکہ اس سے زیادہ اسلام اور مسلمانون کے اعترافِ شکست کی کوئی اور تجویز نہین ہو سکتی، اس سے ہزار درجہ بہتر پاکستان

کی تحریک ہے، جس کے کوئی معنی تو ہین،

اسلامی تمدنی منطقہ کی تحریک کے معنی یہ ہین کہ ہندوستان میں اسلام اور مسلمانون کا قدم جہانتک آگے بڑھا ہے اس کو پیچھے لوٹا لیا جائے، اور کسی ایک جگہ ٹھہر کر قدم جمایا جائے، یہ سطرین بہار کے ایک گاؤن میں بیٹھکر لکھی جارہی ہین، اس لئے یہی صوبہ اس وقت مثال مین پیش ہے، اس صوبہ میں مسلمان ۱۴ فیصدی کے قریب ہیں، ان کی پوری آبادی ۴۲ لاکھ کے قریب ہے، اور اس کی بڑی تعداد پورنیہ میں، اور اس کے بعد دربھنگہ مین ہے، اور کم سے کم پٹنہ، مونگیر اور گیا مین ہے، حالانکہ اس صوبہ کے اسلامی تمدن کے مرکز یہی تینون اضلاع ہین، اور پورنیہ اور دربھنگہ میں مسلمان زیادہ تر کاشتکار اور زمیندار ہیں، اب کیا پورنیہ اور دربھنگہ کے مسلمان پٹنہ اور مونگیر اور گیا مین آجائیں، ایسی حالت میں کیا یہان کے ہندو، ان مہاجر مسلمانون کے بسنے کے لئے زمین اور کھانے کمانے کے لئے جائداد دینگے، اور ان اضلاع کے ہندو یہان سے نکل کر پورنیہ کی خراب آب و ہوا میں رہنا پسند کرین گے، اور اگر پورے صوبہ کے مسلمان بنگال یا یوپی کو ہجرت کرائے جائین تو کیا یہ صوبے ان کو جگہ دے سکتے ہین، اور اگر دیں بھی تو اسلام کا قدم جہانتک آگے بڑھ چکا ہے، اس سے پیچھے ہٹنے کی کوئی معقول وجہ ہو سکتی ہے، کیا یہ اسی غلطی کا اعادہ نہ ہوگا، جو مسلمانون نے سسلی، جنوبی فرانس، اسپین، مالٹا اور کریٹ وغیرہ رومی جزیرون میں کی ہے، کہ جہان سے ان کی سیاسی طاقت کم ہوگئی وہان سے انھون نے ہجرت اختیار کرلی، اور اسلام کے قدم کو آگے بڑھا بڑھا کر پیچھے ہٹاتے رہے، جس کا نتیجہ آج آنکھون کے سامنے ہے!

مقالات

دنیا میں اسلام

(تلخیص، تحشیہ، تعلیق)

از

(مولانا مسعود عالم ندوی)

"دنیا میں اسلام" (Islam in the world)[له] ڈاکٹر زکی علی مصری کی ایک نئی تصنیف کا نام ہے، جس میں عالم اسلام کے تمام مسائل پر بحث کی گئی ہے، اور مسلمانانِ عالم کی مختلف دینی اجتماعی و سیاسی تحریکوں پر ناقدانہ نظر ڈالی گئی ہے، کتاب کا موضوع گو عہد حاضر کا اسلام اور مسلمانوں کی حالت ہے، لیکن منطقی تسلسل قائم رکھنے کے لئے تاریخی پس منظر بھی سامنے لاکر رکھدیا گیا ہے، اور اس سلسلہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت، اسلام اور قرآن مجید کی تعلیمات، اسلام کا نظام اجتماعی خلافت وغیرہ پر مختصر، لیکن جامع اور پر مغز گفتگو کی گئی ہے،

ہر چند کہ ہندوستان اور دوسرے اسلامی ملکون کے باشندے، عالم اسلام اور مسلمانانِ عالم کے فقرے اپنی سیاسی واجتماعی زندگی میں بہ کثرت استعمال کرتے ہیں، لیکن اب تک بہت کم لوگون

له Islam in the world، مولفہ ڈاکٹر زکی علی مصری، صفحات ۴۲۰، تقطیع متوسط، کتابت وطباعت دیدہ زیب، کاغذ نفیس، قیمت للعہ، ملنے کا پتہ:۔ شیخ محمد اشرف کشمیری بازار لاہور، شائع شدہ ۳۸ء

نے اسلامی دنیا کے موجودہ سیاسی واجتماعی حالات کا غائر مطالعہ کرنے کی کوشش کی ہے، کتاب یا تالیف کا تو خیر کوئی ذکر ہی نہیں، البتہ یورپ کی مختلف استعماری طاقتیں اپنے اغراض کے ماتحت اس قسم کی کوششوں کی حوصلہ افزائی کرتی رہی ہیں، اور اسی بنا پر انگریزی، فرنچ، جرمن اور دوسری زبانوں میں اسلامی ممالک پر کتابوں کا ایک ذخیرہ فراہم ہو چکا ہے، اور یہ سلسلہ برابر جاری ہے، لیکن یوروپین مصنفین کی کتابیں بڑی حد تک انصاف وصداقت سے معرا ہوتی ہیں، اور وہ واقعات کو اس درجہ مسخ کرنے کے عادی ہیں کہ صحیح نتیجہ تک پہونچنا دشوار ہو جاتا ہے، اسلئے ضرورت تھی کہ کوئی مسلمان صاحب نظر وصاحب قلم اس ذمہ داری کو اپنے سر لے اور شرعی اصطلاح میں سب کی طرف سے "فرض کفایہ" ادا ہو جائے، ان وجوہ کے ماتحت ہم ڈاکٹر زکی علی مصری کی اس نئی اور مفید کتاب کا تہ دل سے خیر مقدم کرتے ہیں، اور آج کی صحبت میں اس پر ذرا تفصیل سے کچھ کہنا چاہتے ہیں، خصوصیت کے ساتھ اس حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ ایک مسلمان کے قلم سے یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے، (جہاں تک عاجز کی حقیر معلومات کا تعلق ہے) عربی میں ایک کوشش، بلکہ بلیغ کوشش اس قسم کی ہوئی ہے لیکن اس کی ضمنی حیثیت ایک جامع کتاب کی تیاری میں مانع ہو گئی، اس کوشش سے میری مراد امیر البیان علامہ شکیب ارسلان مدظلہ کے ان "حواشی" (فٹ نوٹس) سے ہے، جو انھوں نے اسٹاڈرڈ (Stoddard) امریکی کی کتاب (دی نیو ورلڈ آف اسلام) کے عربی ترجمہ (حاضر العالم الاسلامی) پر سپرد قلم فرمائے ہیں، یہ حواشی معنوی برتری، اور معلومات کی فراوانی کو چھوڑ کر، صرف ضخامت میں بھی اصل کتاب سے تین گونہ زیادہ ہیں، رہی ان حواشی کی معنوی قیمت، سو اس کے متعلق اس قدر کہنا کافی ہے کہ یہ امیر شکیب ارسلان مدظلہ کے پنجاہ سالہ مطالعہ اور مشاہدہ کا نتیجہ ہیں، اور اب تک عالم اسلام کی سیاسی واجتماعی زندگی پر ایسی پر معلومات کتاب کسی زبان میں شائع نہیں ہوئی،......

......لیکن جیسا کہ ہم نے ابھی کہا، انکی ضمنی حیثیت نے کتاب کی قیمت کم کر دی، اور معلومات کا ایسا نایاب ذخیرہ ایک مستقل تصنیف کی صورت اختیار نہ کر سکا، امیر البیان کے حواشی صرف ان مقامات اور ملکوں تک محدود ہیں، جن کے حالات عام طور پر کہیں نہیں ملتے، مصر، شام، عراق، اور اسی طرح ہندوستان کی بعض عظیم الشان تحریکوں کا تذکرہ ان حواشی میں نہیں ملتا، اس کے برعکس ڈاکٹر زکی علی کی "دنیا میں اسلام" گو مختصر، لیکن مستقل اور جامع تصنیف ہے، اس لئے وہ بجا طور پر اپنی نوعیت کی پہلی کتاب کہی جا سکتی ہے،

ڈاکٹر زکی علی مصر کے رہنے والے اور اعلیٰ تعلیم یافتہ، ڈاکٹر (طبیب ڈ سرجن) ہیں، عربی کے علاوہ جرمن، فرنچ اور انگریزی میں بھی اعلیٰ دستگاہ حاصل ہے، ۱۹۳۱ء تک وہ قاہرہ کے سرکاری ہسپتال (قصر العینی) میں سرجن تھے، اس کے علاوہ ان کے دو ذاتی شفاخانے (ڈسپنسری) قاہرہ اور زقازیق (مصر کا ایک شہر) میں کامیابی کے ساتھ چل رہے تھے، ۱۹۳۱ء میں مزید فنی مہارت حاصل کرنے کے لئے انھیں سرکاری وظیفہ ملا، اور وہ یورپ روانہ ہو گئے، عام طور پر ان کا قیام لندن پیرس اور وائنا میں رہا کرتا تھا، اسی دوران میں انھیں عالم اسلام کے حالات سے دلچسپی ہوئی اور وہ مختلف اخبارات اور رسالوں میں، متنوع عنوانات پر مضامین لکھنے لگے، "الفتح" (مصر) "الهداية" (عراق) "البلاغ" (مصر) "مسلم ریویو" لکھنؤ، Genuine Islam، سنگاپور میں ان کے مضامین خود راقم الحروف کی نظر سے اکثر گذرتے رہے ہیں، ابھی ڈاکٹر زکی علی کی یہ نئی دلچسپی شروع ہی ہوئی تھی، کہ انھیں حکومت مصر (؟؟) کی نگاہ عتاب کا شکار ہونا پڑا، "کارکنان قضا وقدر" (!!) کو ان کی یہ مشغولیت ایک آنکھ نہ بھا سکی، ۱۹۳۲ء میں ان کا سرکاری وظیفہ بند کرا دیا گیا، اور اس طرح پر ان کی (قصر العینی) کی ملازمت بھی گئی، نیز دونوں ذاتی شفاخانے کس مپرسی کی نذر ہو گئے، اور ان بیچارہ کو اپنی اسلام دوستی کا مزا چکھنے کے لئے یکہ وتنہا چھوڑ

دیا گیا[۱]، لیکن ذاتی پریشانیون سے ان کے پاے ثبات میں لغزش نہ ہوئی، اور یہ برابر عالم اسلام کے متعلق مضامین لکھتے رہے، اور ساتھ ساتھ مطالعہ بھی وسیع ہوتا رہا، تا آنکہ آج یہ مفید و جامع کتاب ہمارے سامنے رکھی ہوئی دعوتِ ذوق و عمل دیرہی ہے،

کتاب کل ۲۲۴ صفحون پر دو حصّوں میں بٹی ہوئی ہے، پہلے حصّہ میں حسبِ ذیل ابواب ہیں،

پہلے باب میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مختصر لیکن جامع طور پر بیان کی گئی ہے، جس میں کوئی خاص بات قابلِ ذکر نہیں، البتہ مغربی مصنفین کے اقوال بہ کثرت درج کیے گئے ہیں، جو ایک انگریزی تالیف میں معیوب نہیں کہے جا سکتے، خصوصیت کے ساتھ اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھ کر ہمارا نوجوان طبقہ اب تک اپنی باتیں بھی غیروں ہی کی زبان سے سننا چاہتا ہے،

[۱] یہ شبہہ نہ ہو کہ ڈاکٹر ذکی علی نے یہ روداد کہیں اپنے قلم سے لکھی ہے، راقم الحروف کو یہ تفصیلات عربی اخبارات سے معلوم ہوئیں،

دوسرے باب (اسلام: ایک مذہب اور نظام اجتماعی) میں اسلام کی بنیادی تعلیمات مؤثر پیرایہ میں بیان کی گئی ہین، مساوات اور "پاپائیت" کے متعلق مندرجۂ ذیل اقتباس سے مصنف کے خیالات کا کچھ اندازہ ہوگا،:-

"مکمل اجتماعی مساوات کی بنا پر، اسلامی سوسائٹی میں ذات پات کی گنجایش نہیں جو موروثی طور پر کسی امتیاز یا فوقیت کی مستحق ہو سکے،

اسلام میں دینی پیشواؤن کا کوئی فرقہ نہین، نہ کلیسا کی طرح دین کے خدمت گذارون کی کوئی مخصوص تنظیم ہے، پاپائیت کی اسلام میں مطلق گنجایش نہیں، وہ تمام لوگ "علماے دین" میں شامل ہیں، جو دینیات پر عبور رکھتے ہیں، مولویوں کی کوئی ذات نہیں، جو بے لکھے پڑھے موروثی طور پر اس امتیاز کی حقدار ہو جائے، (صـ۲۱")

اس میں کوئی شک نہیں، کہ اسلام میں مولویون کی کوئی ذات نہیں، صرف کتاب و سنت کا علم "عالمِ دین" بننے کی شرط ہے، لیکن افسوس کہ آج کل عام لوگوں کی غفلت اور تعلیم یافتہ حضرات کی دینی علوم سے نفرت نے خود بخود "علمار" کا ایک طبقہ بنا کر لا کھڑا کر دیا ہے،

مصنف نے اس باب میں اسلامی تعلیمات کو نچوڑ کر رکھ دیا ہے، اور بیان کا قالب ایسا ہے جو نئی طبیعتوں کے لئے قابلِ قبول ہو سکے، ہمیں مصنف کی صرف ایک تشریح سے اختلاف ہے جو انھوں نے "جہاد" کے سلسلہ میں کی ہے، فرماتے ہیں،:-

"جہاد یا مذہبی جنگ (لغوی معنی کوشش اور جد و جہد کے ہیں) اصل میں دفاعی تھا، اور مخصوص حالات میں اس کی اجازت دی گئی ہے،: جب مسلمانون پر زیادتیاں ہو رہی ہوں، یا جب انھیں مذہبی عداوت کی بنا پر بے رحمی کے ساتھ گھرون سے نکالا جاتا ہو، یا پھر جب کوئی قوم اسلامی علاقہ پر حملہ آور ہو، اور ملک و وطن کی بے حرمتی پر اتر آئے، یا جب

باغی اور غدار مسلمانوں کو ان کے ملک سے نکالنے کی سازش کریں، (ص۳۴)

یہ تمام صورتیں وہ ہیں جن میں جہاد مشروع بلکہ فرض ہو جاتا ہے، لیکن ان کے علاوہ بھی جہاد کی مشروعیت ہے، جسے سرسیدؒ، علامہ شبلیؒ، شیخ محمد عبدہ، اور پچھلی صدی کے تمام اکابر نظر انداز کرتے آئے ہیں، اسلام یعنی امن و سلامتی کے پیغام کی راہ میں جو کانٹے حائل ہوں، انھیں ہٹا دینا بھی فرض عین ہے، پورے جسم کی تندرستی کی غرض سے اطبار فاسد اعضار کے کاٹنے میں مطلق تامل نہیں کرتے، اسی طرح انسانیت کاملہ کی دعوت و تبلیغ اور قانونِ ربانی کے نفاذ کی خاطر بھی تلوار اٹھانا مشروع کیا گیا ہے، سورہ توبہ اور انفال کی آیتیں اس باب میں بالکل صاف ہیں، یہ موقع اس پر تفصیلی بحث کا نہیں، سید ابو الاعلیٰ صاحب مودودی کی کتاب (الجہاد فی الاسلام) اس مبحث پر اب تک آخری چیز ہے، اور بہت کافی، خلاصہ یہ کہ جہاد کو خواہ مخواہ دفاعی حد تک محدود رکھنا، یورپ سے مرعوبیت کا نتیجہ ہے، پچھلی صدی کے بزرگ معذور تھے، اب تو صداقتوں کو برملا کہنے میں تامل نہ ہونا چاہئے،

تیسرے باب میں (قرآن مجید اور اسلامی قانون) کی بحث آتی ہے، قرآن کریم کے اعجاز پر مختصر روشنی ڈالنے کے بعد، اسلامی قانون کے سرچشموں (حدیث، قیاس، اجماع) سے روشناس کرایا گیا ہے، مصنف نے اس بات پر خاص زور دیا ہے، کہ اسلامی قانون زمانہ کی تبدیلیوں کا ساتھ دے سکتا ہے، ہم بھی اس سے متفق ہیں، کہ اسلامی نظامِ حکومت اور اسلام کے معاشی قوانین آج بھی دنیا کی رہبری کر سکتے ہیں، لیکن اس طرح پر نہیں کہ ان محکم قوانین کو توڑ مروڑ کر زمانہ کے تابع کریں، بلکہ ہم یہ یقین رکھتے ہیں، کہ موجودہ معاشی پیچیدگیوں کا واحد حل اسلامی قانون پر عمل کرنا ہے، مصنف نے ترکی اور ایران کی نئی تبدیلیوں کی مثالیں دی ہیں (ص۴۷) لیکن اس تمثیل سے مسئلہ اور الجھ جاتا ہے، ترکی کی نئی تبدیلیوں میں اسلامی قانونِ میراث کی

منسوخی بھی ہے، تو کیا ہم اسے جائز قرار دیں گے، ؟ البتہ یوگوسلاویا کی طرح تعداد ازدواج پر پابندیاں عائد کی جا سکتی ہیں، مصر کے نمونہ پر ایک مسلم حکومت ازدواج کی عمر کی تحدید کر سکتی ہے لیکن البانوی پارلیمنٹ کی طرح پردہ اور تعداد ازدواج کو ہم بالکل ممنوع قرار نہیں دے سکتے، ڈاکٹر عبد الرزاق سنہوری (صدر شعبۂ قانون، جامعہ مصریہ) کی یہ رائے بالکل صحیح ہے، کہ شریعت میں زمانہ کا ساتھ دینے کی پوری صلاحیت موجود ہے، لیکن اس میں اعتدال اور حزم کی ضرورت ہے،

ڈاکٹر زکی علی بھی بہت معتدل اور سلجھے ہوئے خیالات رکھتے ہیں، لیکن دقت یہ ہے کہ وہ ترکی اور البانیہ کے صریح مخالفِ شریعت قوانین کے خلاف بھی لب کشائی کرنا نہیں چاہتے،

چوتھا باب، (اسلامی نظامِ حکومت) پر ہے، اس میں مصنف نے اسلامی حکومت کا صحیح خاکہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے، خصوصیت کے ساتھ ریاست و کلیسا، یا مذہب و سیاست پر ان کی مختصر بحث بہت کافی و شافی ہے، ہم ذیل میں اس کا ایک حصہ درج کرتے ہیں، :-

"اسلام میں ریاست و کلیسا (مذہب و سیاست) کے متعلق بہت غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے، مغربی مورخین اور نقاد سمجھتے ہیں، کہ مسیحیت کی طرح اسلام میں بھی یہ دو چیزیں الگ الگ ہیں، لیکن یہ ایک وہم ہے، اگر اسلام میں مذہب و حکومت کی کوئی تفریق ہو سکتی ہے، تو وہ صرف برتنے اور عملی جامہ پہنانے میں، اس کے برعکس مغرب میں یہ تقسیم بنیادی (Organic.) حیثیت رکھتی ہے، اسلامی تخیل کے مطابق مذہب اور سیاسیات کے درمیان ایک خط فاصل کھینچنا ناممکن ہے، خاص کر یہ حقیقت پیش نظر رکھتے ہوئے کہ اسلامی زندگی میں مذہب افراد کے تمام روحانی و مادی افعال و اعمال میں یکساں موثر رہتا ہے، دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے، کہ اسلام میں مذہب اور سیاست دونوں کی باہمی آمیزش سے ایک چیز وجود میں آتی ہے، اس لئے

ہم نہایت صفائی کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں، کہ کم از کم مغربی تخیل کے مطابق کلیسا (church) کا وجود اسلام میں نہیں پایا جاتا، اور اسی طرح ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اسلام حکومت ہے اور حکومت اسلام، (ص ۵۶-۵۷)

یہ تو نظریہ تھا عملی تطابق میں بھی مصنف کا تخیل صاف ہے:۔

"اگر بعض اسلامی ملکوں میں جن کا دستور مغربی طرز پر بنایا گیا ہے، اسلام سرکاری مذہب قرار دیا گیا ہے، تو اس کی حیثیت ایک ضابطہ سے زیادہ نہیں، اور یہ بالکل ایک سطحی بات ہے، اسلامی حکومت میں سیاست مذہب سے مل کر ایک مجموعہ (Entity) بنتا ہے،

چودہ سو سال کی طویل مدت میں چشم گیتی نے صرف ایک بار صحیح اسلامی حکومت کا نقشہ دیکھا ہے،...... ہمارے زمانہ میں جہاں خالص دینی اسلامی حکومت کامیابی کیساتھ چلائی جارہی ہے، وہ ابن سعود کے زیر نگیں عربی علاقہ ہے، (ص ۵)

موجودہ عہد میں مصنف اسلامی حکومتوں کی ایک مجلس یا "کامن ولتھ آف اسلامک اسٹیٹس" کا خواب دیکھتا ہے، یقینی اس عہد میں نگاہ تصور اس سے آگے نہیں اٹھ سکتی، لیکن اس کے معنی نہیں کہ اسلامی نظام حکومت، مختلف نوابیوں یا حکومتوں کے وفاق کی حوصلہ افزائی کرتا ہے[۱]

[۱] جامعہ اکتوبر ۳۸ء میں ڈاکٹر عبدالحمید صاحب زبیری نے بھی انہی خیالات کا اظہار کیا ہے، انکے الفاظ یہ ہیں:

"بین الاقوامی سیاست میں جدید حالات میں اسلام صرف ایک بین الاقوامی وفاق کا ہی قائل ہو سکتا ہے، اقوام آزاد ہوں لیکن وہ انسانیت کی خدمت کیلئے باہم متحد ہوں، اسلام کا سیاسی نصب العین تو دراصل تمام دنیا میں ایک عالمگیر حکومت کا قیام ہے، لیکن جب تک انسانیت کا شعور عام نہ ہو جائے، اسوقت تک صرف یہی درمیانی راہ ممکن ہو سکتی ہے؛"

اسلامی نظام میں امیر مطاع ایک ہی ہو سکتا ہے، جس کی حیثیت احکام خداوندی کے نافذ کرنیوالے کی ہوگی، اور اس امیر المومنین کے ہاتھوں میں قوت ہونا چاہئے، کہ اسلامی نظام کی بنیاد حکومت پر قائم ہے، اور قوت کے بغیر حکومت کی کوئی حیثیت نہیں ہوگی،

اسلامی نظام حکومت میں قانون الٰہی کی اہمیت و برتری کا مصنف کو پورا احساس ہے، اسی لئے وہ "کمالی اصلاحات" کو صحیح اسلامی اصلاح کا نمونہ نہیں قرار دیتا، ترکی، بلکہ کمالی اصلاح کی غیر شرعی حیثیت کو واضح کرتے ہوئے مصنف نے ایک کمالی (فالح رفقی) کا یہ فقرہ نقل کیا ہے، جس سے "کمالی اصلاحات" کی اسپرٹ کا اندازہ ہوگا:۔

"عیسائیت کا "قرون وسطے" پندرہویں صدی میں ختم ہوگیا، . . . .

. . . . . . لیکن اسلام کا "قرون وسطی" اب تک ختم نہیں ہوا، البتہ کمالی اصلاحات نے ترکی میں اس کا قلع قمع کر دیا ہے؛ (ص ۹)

یہ اقتباس فالح رفقی کی کتاب La Turquie Kamaliste سے ماخوذ ہے، جس پر کسی حاشیہ آرائی کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی،

مصنف کے خیال کے مطابق ترکوں کی اس بے راہ روی کی وجہ یہ ہوئی، کہ انھوں نے عثمانی حکومت کو اسلامی حکومت کا نمونہ سمجھا، اور جو خرابیاں انھیں اس طرز حکومت میں نظر آئیں، وہ اسلام کے سر منڈھ دی گئیں، کمالی عہد میں ترکی میں دوہرا انقلاب ہوا، ایک یونان اور خلفا کی چیرہ دستیوں کے خلاف، دوسرا ملک کی موجودہ سیاسی و اجتماعی صورت حال کے خلاف رونما ہوا، چونکہ ۲۲-۱۹۲۱ء کی ترکی پر کسی نہ کسی رنگ میں اسلامی اثر باقی تھا، اسلئے پر جوش انقلابیون نے خود اسلامی نظام کو ترقی کی راہ کا روڑا قرار دیا، وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ موجودہ طرز حکومت کو اسلامی نظام سے دور کا تعلق بھی نہیں، (خلاصہ ص ۱۰)

"اہلِ یورپ کی طرح وہ بھی اسلام کو عثمانی طرزِ حکومت کے آئینہ میں دیکھنے لگے،

جسے متعدد لحاظ سے اسلام کی روح، اصول اور خلافتِ راشدہ کے نظام سے دور کا

بھی تعلق نہیں تھا، اسلام کو بعض مسلمانوں، یا مسلم حکومتوں کے عمل سے جانچنا خطرناک

ہے، (ص ۱۶)

مصنف کو ترکوں کی اس بے راہ روی سے دوستانہ گلہ ہے، لیکن راقم الحروف کو بالکل شکوہ نہیں، ترکی جہان ہے طبعی حالات کے موافق اسے وہیں ہونا چاہئے، حالات کی رفتار اور علماء کے جمود کا نتیجہ یہی ہونا تھا، البتہ ہم ترکوں کے اسلامی مستقبل سے مایوس نہیں بقول حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے،

خالات ایسے ہیں کہ ترک اسلامی برادری سے الگ رہ کر نپپ نہیں سکتے، ایک ترکی جرنیل کے

بیان کے مطابق یہ آندھی آئی ہے، اور نکل جائے گی"

ہمیں ترکوں سے گلہ نہیں لیکن ان کے جا و بیجا حرکات کی مدح سرائی بھی ہمارا شیوہ نہیں، غلط کو غلط ہی کہا جائے گا، خواہ مخواہ اسکی تصحیح و تحسین کی ضرورت نہیں،

"اسلامی نظامِ حکومت" کے بعد مصنف نے (خلافت) پر بحث کی ہے، جہاں تک خلفاء کی تاریخ اور عہد بعہد کی تبدیلیوں پر تبصرہ کا تعلق ہے، اس میں کوئی نئی بات نہیں، خلیفہ اور خلافت کی حیثیت اور فرائض کے متعلق البتہ اختلافِ رائے کی گنجائش ہے، مسرت کی بات ہے، کہ مصنف کا تخیل اس باب میں بہت واضح ہے، محکمہ قضاء (عدالت اور قوتِ نافذہ (Executive) کی علیحدگی موجودہ طرزِ حکومت کی نمایاں خصوصیت ہے، خلافت میں قانون (شریعت) اور قوت نافذہ کے باہمی تعلق کی کیا حیثیت ہے؟ اس کی تشریح ملاحظہ ہو:-

"شریعت عدالت اور قوت نافذہ میں تفریق نہیں کرتی، یہ عدالت کو قوتِ نافذہ کے تابع

کرتی ہے، لیکن یہ تابعیت اور ماتحتی عملی طور پر اثر انداز نہیں ہوتی، اسلئے کہ خلیفہ (قوت نافذہ) اور قاضی (عدالت) دونوں قانون (شریعت) کے سامنے سر جھکانے پر مجبور ہیں، عدالت اور قوتِ نافذہ ایک جانب، اور قوتِ قانون ساز دوسری جانب، ان دونوں میں مکمل تفریق ہے، موجودہ قانون سے بھی زیادہ اسلامی قانون میں یہ تفریق نمایاں طور پر نظر آتی ہے"، (ص ۶۷)

مصنف کا خیال صحیح ہے، اصل سوال قوتِ قانون سازی کا ہے، اسلام میں قانون سازی کا اختیار صرف شارع کو ہے، خلیفہ کا کام قانونِ الٰہی کا نافذ کرنا ہے، اور بس،

خلافتِ راشدہ یا صحیح اسلامی حکومت صرف تیس سال رہی، اس کے بعد ملوکیت کا دور دورہ شروع ہو گیا، پھر بھی اسے کسی نہ کسی درجہ میں "خلافت" کے لفظ سے یاد کیا جاتا ہے:-

"ایک خالص دینی نظام سے شروع ہو کر مدینہ میں اسلام کی حیثیت اصل میں مذہبی اور ضمنی طور پر ایک سیاسی نظام کی ہو گئی، خلافت راشدہ کے دور میں دونوں حیثیتیں برابر ہو گئیں، بعد کی غیر قانونی ([illegible]) خلافتوں میں اس کی حیثیت سیاسی اور ضمنی طور پر مذہبی نظام کی رہ گئی، .... پھر بھی "یہ غیر قانونی" خلافت محض ثانوی چیز نہیں کہی جا سکتی، اس لحاظ سے اس کی اہمیت بڑھ جاتی ہے کہ یہ نظام تیرہ سو سال تک چلتا رہا ہے، (ص ۶۵)

خلافت کا منصب خلفائے راشدین سے لیکر سنہ ۱۹۲۴ء تک کسی نہ کسی صورت میں موجود رہا، اس طویل مدت میں صرف ایک مرتبہ مستعصم عباسی کے انتقال کے بعد عالمِ اسلام کا کوئی نگران یا خلیفہ نہ تھا، یہ صورت ساڑھے تین سال سے زیادہ نہ رہی (ص ۶۷)

مصنف کے نزدیک موجودہ حالات میں ایک مرکزی حکومت کا بقا و استحکام بہت دشوار ہے

اور عثمانی حکومت کے زوال کا باعث بھی یہی کمزوری تھی، (صـ۸۲) ترکوں کے الغاے خلافت کی مصنف نے مختلف توجیہیں کی ہیں، اور اپنے کو غیر جانبدار رکھنے کی پوری کوشش کی ہو (۹۲-۸۰) اصل یہ ہے کہ جمہوریت کے اعلان، اور سلطان کا منصب ختم کرنے کے بعد (اکتوبر ۲۳ء) خلافت اور خلیفہ کی کوئی گنجایش ہی نہیں رہ گئی تھی، مسلمان خلیفہ پوپ نہیں ہوتا، اور اکتوبر ۲۳ء سے مارچ ۲۴ء (الغاے خلافت اور سلطان کی جلاوطنی کی تاریخ) تک سلطان عبد المجید کی حیثیت پوپ سے زیادہ نہیں تھی، اسلئے بعض مفکرین کا کہنا بھی صحیح ہے، کہ اس نام نہاد منصب سے اس کا نہ ہونا ہی بہتر تھا، دوسری طرف اسلامی وحدت اور احیاے خلافت کا خواب دیکھنے والوں کو اہل انگورہ کی یہ حرکت طبعی[1] طور پر بہت ناگوار گذری کہ ان کی رہی سہی امیدوں کا بھی خاتمہ ہو گیا، آج چودہ سال ہو گئے، لیکن اس منصب کا کوئی لائق دعویدار نہیں ملتا، سنتے ہیں، لوگ مصر کے نوجوان فرمانروا شاہ فاروق کو یہ اعزاز عطا کرنا چاہتے ہیں، لیکن اس کے لئے قوت درکار ہے، جس سے ابھی مصری حکومت محروم ہے،

"اسلامی تمدن" (۹۵-۱۵۰) پر مصنف کا فاضلانہ مضمون پر مغز اور معلومات سے لبریز ہے، علم وعمل کے تمام مدنی ([illegible]) شعبوں پر مسلمانوں کے احسانات جامعیت کے ساتھ شمار کرائے گئے ہیں، ڈاکٹر زکی علی کا مطالعہ وسیع ہے، اور حقائق کی گرفت کی صلاحیت انھوں نے بہت اچھی پائی ہے، یوں تو علم کی تمام شاخوں میں مسلمانوں کی خدمات بیان کی گئی ہیں، لیکن خصوصیت کیساتھ طب اور سرجری کے متعلق معلومات نہایت قیمتی ہیں، اپنے فن اور پیشہ کے لحاظ سے اتنا امتیاز ہونا بھی چاہئے تھا، اس پُرمغز اور مفصل بحث کی تمہید کا ترجمہ شاید مصنف

[1] ہندوستان، مصر، اور شام وعراق نے الغاے خلافت کے خلاف اظہار برہمی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی، مصر کے امیر الشعراء مرحوم احمد شوقی نے ایک دلدوز مرثیہ بھی لکھا تھا،

کے زاویۂ نظر اور طریقۂ فکر کا اندازہ لگانے کے لئے کافی ہو:

"اسلام صرف ایک عقیدہ اور سیاسی تخیل نہیں، بلکہ ایک تمدن بھی ہے، جو متضاد اجزاء سے مرکب ہونے کے باوجود ایک مخصوص وحدت کا مالک ہے، مذہب ان اجزاء کے درمیان رشتۂ وحدت کا کام دیتا ہے، اس میں کسی شک وشبہہ کی گنجایش نہیں، کہ سیاست اور تمدن دونوں کی نشو ونما مذہب کی مرہون منت ہے، ایک متحدہ اسلامی تمدن کی تشکیل کا سہرا اہم مذہب کے سر اسلئے باندھتے ہیں، کہ مسلمانوں کی زندگی میں مذہب ہی سب سے زیادہ موثر اور کارفرما عنصر ہے، نیز اسلام کی تمام تاریخی ترقیاں، رسول کریم (ص) کی تعلیمات کا براہ راست نتیجہ ہیں"

(ص ۹۵)

کتاب کی ساتویں فصل اسلام کے حلقۂ اثر کی وسعت کے لئے مخصوص ہے، جس میں آغاز اسلام سے آج تک کی تبلیغی کوششوں پر روشنی ڈالی گئی ہے، اور اسلامی طریق دعوت کو اُجاگر کیا گیا ہے، اس موضوع پر اردو میں بھی بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، آرنلڈ کی دعوتِ اسلام کے بعد استاذ محترم حضرت علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ کا مقالہ (ہندوستان میں اسلام کیونکر پھیلا؟) بہت کافی ہے، نیز (عرب وہند کے تعلقات) میں بھی کافی مسالہ موجود ہے، البتہ جو کچھ اردو میں ترجمہ ہوا یا لکھا گیا ہے، وہ زیادہ تر ہندوستان سے متعلق ہے، ڈاکٹر زکی علی نے دنیاے اسلام پر نگاہ ڈالنے کی کوشش کی ہے، اور یورپ میں اسلام کی توسیع پر اچھا خاصہ مواد فراہم کر دیا ہے، افریقہ میں اسلام کی کامیابیوں کا بھی تذکرہ ہے، لیکن اس سے بہت زیادہ جامع ذکر (حاضر العالم الاسلامی) کے حواشی میں ہے، (ملاحظہ ہو، جلد سوم ص ۱۰۸ - ۲۰۰) با ایں ہمہ کتاب میں جسقدر بھی تذکرہ ہے، اردو میں شاید اب تک نہیں آیا،

بنو امیہ کے بارے میں مصنف کو ایک غلط فہمی ہو گئی ہے، مغربی مصنفین اور جرجی زیدان کے

پروپگنڈے سے وہ بھی یقین کر بیٹھے، کہ بنو امیہ غیر عربون کو حقیر سمجھتے تھے، اور دل سے اسلام کی تبلیغ بھی ان کے پیش نظر نہیں تھی، استاذ الاساتذ حضرت علامہ شبلی نعمانیؒ نے الانتقاد میں اسکی حقیقت اچھی طرح واضح کر دی ہے، بنو امیہ کی "عربیت" کی اصلیت صرف اتنی ہے، کہ عباسیون کی طرح ان کے عہد میں ایرانی اور ترکی عناصر کا حکومت میں کوئی دخل نہیں تھا، اور ابن خلدون کی رائے کے بموجب قومی عصبیت سلطنت کے استحکام و بقا کے لئے ضروری ہے، "عرب نیشنلزم" یا اس قسم کا اور کوئی خیال ان کے ذہن میں قطعاً نہیں تھا،

مصنف کا یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ اگر روس مسلمان ہوتا، تو وہاں "اشتراکیت" کیلئے کوئی گنجایش نہیں باقی رہتی" (ص ۱۶۳)

"ایک قوم مسلمان ہو جانے کے بعد، پھر اپنا مذہب ترک نہیں کرتی، ترکی جو حکومت کا تعلق مذہب سے علی الاعلان قطع کر چکی ہے، اس (ترکی) میں بھی اشتراکیت کی تبلیغ نہیں کی جاسکتی، اور ترکی حکومت میں بالشویزم کا مبلغ سزا کا مستوجب ہوتا ہے"

(ص ۱۶۴)

ہمارے بعض کمیونسٹ دوستون کو یہ غلط فہمی ہے، کہ ترکی کا "کمالی انقلاب" بھی مارکس کے نظریہ کے مطابق "بورژوا جمہوری انقلاب" کی ایک شکل تھا، اور اس طرح پر یہ اصلی پولتاری (Proletariat) انقلاب کا پیش خیمہ ہے، انھیں شاید معلوم نہیں کہ انگورہ کا انقلاب اغیار کی چیرہ دستیوں اور ملک کی اندرونی کمزوریوں کے مقابل ظہور پذیر ہوا تھا، اور اس لحاظ سے یہ اپنے مقصد میں کامیاب رہا، حالات ایسے ہیں کہ اسلامی ملکون اور حکومتوں میں اشتراکیت کے پھولنے پھلنے کا امکان بہت کم ہے، اسکو سمجھنے کے لئے وہان کے حالات پر غائر نظر ڈالنے کی ضرورت ہے، ورنہ یہ حقیقت ذہن نشین نہیں ہو سکتی، موقع ملا تو ہم اس پر کبھی تفصیل سے لکھیں گے،

یوگوسلاویا میں اسلام کی ہمہ گیری کا تذکرہ کرتے ہوئے، مصنف نے معلوم نہیں کس حیثیت سے ایک مسلمان ایکٹرس کا ذکر کیا ہے، (ص ۱۶۸) ہمیں مسلمانان یوگوسلاویا کی ترقی، اور تجدد سے انکار نہیں، اور نہ اس پر اعتراض ہے، ہندوستان کب اس سے بچا ہوا ہے، ؟ لیکن اسلام کی ہمہ گیری کے سلسلہ میں ایک مسلمان خاتون کی "تمثیلی برتری" پر زور دینا البتہ تعجب انگیز ہے، کم از کم ہم مشرقی اور اسلامی تہذیب کا دم بھرنے والوں کے لئے تو ضرور تعجب انگیز ہے، یورپ کے مسلمانون کے متعلق، اس باب میں مفید معلومات جمع کی گئی ہیں، جو پڑھنے کے لائق ہیں،

آٹھویں باب میں "اسلام کے ارتقاء" کی بحث آتی ہے، آغاز میں لائق مصنف نے آخری صدیوں میں مسلمانوں کے انحطاط کے اسباب پر گفتگو کی ہے، ارتقاء کے تذکرہ سے پہلے انحطاط کی تحلیل بھی ضروری تھی، اس بحث میں اونھون نے مجاہد جلیل حضرت علامہ شکیب ارسلان کے مشہور رسالہ (لماذا تأخر المسلمون وتقدم غیرهم) "مسلمان کیوں پیچھے رہے اور دوسرے کیوں بڑھ گئے"، سے کافی فائدہ اٹھایا ہے، جس کا اردو ترجمہ بھی سیرت کمیٹی نے (اسباب زوال امت) کے نام سے شائع کر دیا ہے،

"اسلامی حکومت کے زوال کے ساتھ علماء "ایک محدود اسلام" کے دائرہ میں سوچنے لگے، ان کے تخیل میں عالمگیر حریت کا پیامبر مذہب نہیں رہا تھا، بلکہ ایک مقید اور تنگ مذہب سے آگے ان کا تصور نہیں بڑھتا تھا، آزاد خیالی اور حریت فکر کا علم بردار مذہب مولویوں اور پیرون کی تنگ خیالی کا شکار ہو گیا"، (ص ۱۷۱)

آٹھویں صدی ہجری کے بعد علماے دین کی جو حالت ہو گئی تھی، اس لحاظ سے مصنف کا لہجہ پھر بھی نرم ہے،

لیکن حالت یہ ہو گئی، کہ علماء جنھیں صحیح روایات اور اسلامی تعلیمات کا محافظ ہونا چاہئے تھا،

ان کی توجہ مذہبی رسوم کی معمولی جزئیات تک محدود ہو کر رہ گئی، حقیقت یہ ہے کہ یہ روشِ بدعت
سے انحراف کے ہم معنی تھا۔ (ص ۱۶۳)

تقدیر پر بے جا اعتماد اور "توکل" کو غلط سمجھنا، مصنف کے نزدیک جمہور کی اقتصادی تباہ حالی
کا ایک بڑا سبب ہے، (ص ۱۶۴) اشخاص کا مسلمانوں کے مفاد پر حاوی ہو جانا بھی مسلمانوں
کی تباہی کا باعث ہوا، شخصی اغراض اور ذاتی برتری کے جذبہ کے ماتحت اسلامی حکومتوں
کے ٹکڑے ٹکڑے بھی اسی شخصیت پرستی کے باعث ہوئے، اور زیادہ افسوس یہ ہے، کہ مذہبی
جذبات کو ہوا دے کر اپنے اغراض کو پورا کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا گیا، (ص ۱۶۵)

خلاصہ یہ کہ مصنف کے نزدیک مسلمانوں کے انحطاط کے چار اہم اسباب یہ ہیں:۔

۱- ملا پرستی اور دینی تعلیم کا محدود ہو جانا، (ص ۱۶۱-۱۶۴)

۲- شخصیت اور استبداد پرستی (Autocracy) (ص ۱۶۵)

۳- اسلاف کے کارناموں پر بے جا تکبر، (ص ۱۶۶)

۴- احکام مذہب کی تعمیل سے غفلت اور انحراف (ص ۱۶۷)

ایک طرف علماء اور عام مسلمانوں کی یہ حالت تھی، دوسری طرف صلیبی جنگوں کے بعد یورپ
کا اقتدار روز بروز بڑھنے لگا، تا آنکہ اٹھارویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی میں ہم مسلم حکومتوں کو
زندگی و موت کی کشمکش میں گرفتار پاتے ہیں،

لیکن مسلمانوں کی یہ کمزوریاں اپنی آپ پیدا کردہ تھیں، خود اسلام میں زمانہ کے مقابلہ کی
پوری طاقت موجود ہے، جوں جوں علماء کا جمود بڑھتا گیا، مصلحین اور مجددین بھی ظہور پذیر ہونے لگے
آٹھویں صدی ہجری میں امام ابن تیمیہ[1] نے پہلے پہل اعتدال کی راہ دکھائی، اور جمود (ملائیت) وجود

[1] ابن تیمیہ مولود ۶۶۱ھ، متوفی ۷۲۸ھ۔

(مذہب سے انحراف) کے خلاف علمی جہاد بلند کیا، ابن تیمیہ اور ان کے شاگرد امام ابن قیم کے بعد یہ آواز پھر
چند صدیوں کے بعد شیخ الاسلام محمد بن عبد الوہابؒ نے بلند کی، مصنف نے عام خیال کے مطابق لکھا ہے
کہ محمد بن عبد الوہاب امام ابن تیمیہ کی تصنیفات سے متاثر ہوئے تھے، (ص ۱۶۷) لیکن محققین اور اہلِ نظر
کا خیال ہے کہ ابن تیمیہ کی کتابیں، شیخ الاسلام تک نہ پہونچ سکی تھیں، بہرحال یہ ایک مستقل بحث ہے،
جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، کہنا یہ ہے کہ محمد بن عبد الوہاب نے پہلے پہل بدعات اور عام زبون
حالی کے خلاف مؤثر عملی قدم اٹھایا، ہمیں مصنف کی اس رائے سے بھی اختلاف ہے، کہ ہندوستان
کی وہابی تحریک اور شمالی افریقہ کی سنوسی دعوت پر نجد کی محمدی تحریک کا اثر تھا، یہ غلط فہمی اصل
میں مغربی مصنفین کو ہوئی ہے ہم نے اسکی مدلل تردید ایک دوسرے مضمون میں کی ہے،[1] نجد کی
وہابی تحریک، اور گذشتہ صدی کی دوسری اصلاحی تحریکوں کا مختصر ذکر علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے
رسالہ (اسلام اور احمدیت) میں بھی آگیا ہے تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، (حاضر العالم الاسلامی
جلد ۴، ص ۱۶۱-۱۶۲)

قدرتی طور پر ابن تیمیہؒ، ابن قیمؒ، محمد بن عبد الوہابؒ، سنوسیؒ، سید احمد بریلویؒ، اسمٰعیل شہیدؒ
کی تحریکات عام یوروپین کتابوں میں اچھی طرح بیان نہیں کی گئی ہیں، اسی لئے "اسلام کے ارتقاء"
کے سلسلہ میں مصنف ان تحریکوں کا حق ادا نہ کر سکے اور اسکی جانب راقم الحروف نے مختصر طور پر اشارہ کر دینا
ضروری خیال کیا، ہندوستان کی اسلامی تحریک جہاد (جو "وہابیت" کے نام سے مشہور رہی) کا تو
نام بھی نہیں آیا،

اس کے برعکس سر سید احمد خان مرحوم کی ان کوششوں کا ذکر پر زور الفاظ میں کیا گیا ہے

[1] ملاحظہ ہو، (وہابیت: ایک دینی و سیاسی تحریک) الہلال، پٹنہ، اپریل، مئی، جون ۴۷ء، انسائیکلو پیڈیا
آف اسلام میں محمد بن شنب جزائری نے بھی یہی خیال ظاہر کیا ہے،

جوانھوں نے ارتقاے اسلام کے سلسلہ میں انجام دی تھیں (صنہ ۱) سرسید اسکول کے متبعین اور ان کے نقطۂ خیال کی ترجمانی کرنے والوں میں مولوی چراغ علی، سید امیر علی، اور صلاح الدین خدابخش کی خدمتوں کو بھی سراہا گیا ہے،

مصنف نے حکیم اجمل خان مرحوم اور جامعہ ملیہ کا ذکر بھی کیا ہے، لیکن وہ اسے علی گڈھ تحریک سے الگ نہیں قرار دے سکے (۱۸۰) البتہ جامعہ کی خصوصیت کی طرف اشارہ موجود ہے، ہم ایک مصری صاحبِ قلم سے جو یورپ میں بیٹھ کر کتاب لکھ رہا ہو، یہ توقع نہیں کر سکتے، کہ وہ ہر ہر جزئیہ کو ٹھیک ٹھیک سمجھے، پھر بھی ڈاکٹر زکی علی اپنی اس کوشش میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں!

ہندوستان کی جدید تحریکوں کے سلسلہ میں وہ حضرت علامہ اقبالؒ کو خوب سمجھے ہیں، اور ان کے افکار و خیالات کی صحیح ترجمانی کی ہے، علامہ کے خطبات "جو تشکیل جدید[1]......" کے نام سے چھپے ہیں، ان کی نظر سے گذر چکے ہیں، جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے، ڈاکٹر عبد الوہاب عزام (استاذ فارسی، جامعہ فواد الاوّل[2]، قاہرہ) کے بعد، ڈاکٹر زکی علی، دوسرے مصری بلکہ عربی اہلِ قلم ہیں، جو حضرت علامہ کی منزلت پہچاننے میں کامیاب ہوئے ہیں، اس سلسلہ میں مصنف نے ایک مغربی فاضل (Martin Sprengling) کی ایک تحریر بھی نقل کی ہے، جو شکاگو کے رسالہ Christendom میں شائع ہوئی تھی، ظلم ہوگا، اگر ناظرین کو اس لذت میں شریک نہ کیا جائے، مصنف رقمطراز ہیں:۔

"سر اقبال کی اس تصنیف (تشکیل جدید) کی صحیح قدر و قیمت ظاہر کرنے کیلئے مناسب ہوگا، اگر ہم ایک لائق مغربی فاضل کی رائے نقل کر دیں، خاصکر اس نقطۂ نگاہ سے کہ اس میں مغرب و

[1] Reconstruction of Religions Thought in Islam

[2] جامعہ مصریہ کا نام بدل کر اب جامعہ فواد الاوّل رکھ دیا گیا ہے۔

اسلام کے تعلقات کی طرف اشارہ ہے:۔

"ایک محدود اور مخصوص حلقہ کے علاوہ عام طور پر سر محمد اقبال سے مغربی دنیا کی حقہ واقف نہیں،...... محمد اقبال ممکن ہے مورخ نہ ہوں، لیکن وہ ایک انتہائی اعلیٰ طبقہ کے مذہبی اور ماہر دینیات (Theological) فلسفی ہیں، اور غیر معمولی قابلیت کے معدن لعل و گہر، چونکہ وہ مسلمان ہیں، اسلئے مغرب کے لئے ان کا پہچاننا اتنا آسان نہیں، جتنا گنجلک (abstruse) اور مبہم (obscure) ٹیگور یا...... گاندھی کا ہوتا ہے، جس میں روزانہ نئے مفکرین، نئے مقررین، شہرت یافتہ مصنفین کا انکشاف ہوتا رہتا ہے، ہندوستان، چین اور جاپان سے نت نئے فلسفیانہ، سیاسی، فنی خیالات کی درآمد ہوتی رہتی ہے،...... ہم یہاں یورپ کو ایک نہایت غیر معمولی، اور حیرت انگیز جوہر سے روشناس کرانا چاہتے ہیں، ایک سچا متجدد مسلمان، جو مغرب کی اعلیٰ سے اعلیٰ ترین شخصیتوں کے مقابلہ میں اگر ہر اعتبار سے قابلِ ترجیح نہیں، تو برابر ضرور ہے، الخ، (صنہ ۱۸۱-۲)

ترکی کا تذکرہ کرتے ہوئے مصنف نے سعید حلیم پاشا کی اصلاحی تحریک کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، وہ دراصل خلافتِ راشدہ کے تخیل کو عصری (ماڈرن) جامہ پہنانا چاہتے تھے، صحیح اسلامی حکومت کے قیام کی فکر انھیں برابر لگی رہی، ان کے خیالات کا اندازہ لگانے کے لئے اون کا رسالہ[1] "مسلم سوسائٹی کی اصلاح" (The Reform of Muslim Society) کافی ہے،

[1] اس مضمون کی طرف اشارہ ہے، جو سعید حلیم پاشا مرحوم نے اپنی شہادت سے کچھ ہی دنوں پہلے ایک فرنچ رسالہ کیلئے لکھا تھا، اس میں ان اسلامی خیالات کا خلاصہ یا انکی جھلک موجود ہے، جو مرحوم نے اپنی مشہور ترکی کتاب اسلاملشمق (Islamlashmaq) میں ظاہر کئے تھے، اسکا انگریزی ترجمہ عبد القیوم صاحب ملک کے قلم سے "اسلامک کلچر" جنوری ۲۷ء میں شائع ہوا تھا، اب انجمن خدام الدین لاہور نے مستقل رسالہ کی صورت میں شائع کر دیا ہے،

امام سید جمال الدین افغانی، شیخ محمد عبدہ اور ان کی تحریکوں پر بھی اچھی خاصی روشنی ڈالی گئی ہے، سید رشید رضا مرحوم کی خدمات کا ذکر بھی شاندار الفاظ میں کیا گیا ہے،

مصر کی تحریک تجدد (ماڈرنزم) کا بھی سرسری ذکر آیا ہے، اور اس کے علم برداروں میں قاسم امین، فرید وجدی، علی عبد الرزاق کے نام لئے گئے ہیں، (۱۸۶) اب اس "تجدد" کے کارنامے بھی مختصر طور پر اس حقیر کی زبانی سن لیجئے:-

قاسم امین اس وقت مصر میں عورتوں کے نجات دہندہ خیال کئے جاتے ہیں، سب سے پہلے انھی نے پردہ کے خلاف آواز بلند کی، اور آج مصر کی عورتیں انھی کی بتائی ہوئی راہ پر چل کر اس نقطہ پر پہونچ گئی ہیں، جہاں یہ سوال پیدا ہوگیا ہے کہ وہ عورتیں بھی رہیں، یا نہیں،؟ اور اب خود وہ اس بے پردگی کے نتائج سے گھبرا کر چلا اٹھی ہیں، عزیزہ عباس عصفور، مدرسۃ الحقوق (لا کالج) کی ایک طالبہ کی مہم اور جہاد، قاسم امین کا ردعمل ہے،

فرید وجدی اور علی عبد الرزاق ابھی زندہ ہیں، فرید وجدی کا عالم ضعیفی میں بڑا کارنامہ یہ ہے کہ وہ ترکی، البانیہ اور بعض دوسری حکومتوں کے خلاف شریعت قانون کی پرزور حمایت کرتے ہیں، ان کے نزدیک اذان اور نماز کی ادائگی اصل ماثور اور عربی کلمات میں ناجائز قرار دی گئی، تو کوئی ہرج نہیں، ان کے خیال میں کمالی حکومت کا ہر فعل قابل ستایش ہے، تین چار سال ہوئے الفتح (مصر) کے صفحات پر علامہ مصطفےٰ صبری (سابق شیخ الاسلام حکومت عثمانیہ) اور فرید وجدی کے درمیان زبردست معرکہ آرائی ہوئی تھی، پھر امیر شکیب درمیان میں آپڑے اور انھوں نے بھی وجدی صاحب کو قائل کرنے کی کوشش کی، لیکن ان کا یہ عذر تھا، (لا اتراک فی حالۃ ثورۃ لم تنتہ بعد) ترک ابھی ہیجان کی حالت میں ہیں، اسلئے ان کی غلطیاں لائق درگذر ہیں،

۵ یہ انھی کا فقرہ ہے اور امیر شکیب نے اسی کو اپنے مضمون کا سرنامہ قرار دیا تھا،

لیکن یہ منطق ہماری سمجھ میں نہیں آتی یہ مانا کہ ان سے غلطیاں ہیجان کے عالم میں سرزد ہوئیں اور ہو رہی ہیں، لیکن اس سے انکے غلط اعمال کی مدح وستایش کیوں ضروری قرار دیجاتی ہے،؟ محبت سے انھیں متنبہ کیوں نہیں کیا جاتا،؟

علی عبد الرزاق، فرید وجدی اور قاسم امین کے ہم پلہ یا کسی غیر معمولی قابلیت کے آدمی نہیں، ان کا واحد "متجددانہ" کارنامہ ان کی تالیف (الاسلام واصول الحکم) ہے جس میں انھوں نے خلافت سے انکار کیا ہے، ان کے خیال میں خلافت راشدہ کوئی دینی چیز نہیں تھی، رسول کریم (صلعم) کے بعد کسی نہ کسی طریقہ مملکت کا ہونا ضروری تھا، حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ (وغیرہما) اتفاق سے منصب حکومت پر حاوی ہوگئے" الخ یہ وہی کتاب ہے جس کا ۲۵ء میں بڑا غلغلہ تھا، ازہر کی سرکار نے علی عبد الرزاق صاحب کی عالمیت کی سند ضبط کرلی تھی، اور قضا کا عہدہ ۵ انھیں خالی کرنا پڑا تھا، ان کے رد میں متعدد کتابیں بھی شائع ہوئی تھیں،

اس باب کے آخری صفحات (۱۹۴-۱۸۷) میں مصنف نے موجودہ تجدد کی لہر اور اسلامی یکجہتی میں تطابق پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، دوسرے الفاظ میں وہ موجودہ تفرنج اور مغربیت کے سیلاب سے مایوس نہیں، نہ اسلامی ملکوں میں افرنگی قومیت وطنیت کے جذبات کی پرورش سے وہ بددل ہیں، پنڈت جواہر لال نہرو کے جواب میں، حضرت علامہ اقبالؒ نے چند سال پیشتر جو کچھ لکھا تھا، اس سے مصنف کو بہت تقویت ملی، ملت اسلامیہ کے نبض شناس نے سوشلسٹ پنڈت کے اس خیال کی سختی سے تردید کی تھی، کہ "اس وقت اسلامی یکجہتی (Solidarity) کا

۵ سنا ہے، کہ وفدی حکومت کے دور میں انھیں پھر سرکاری منصب سے سرفراز کیا گیا ہے

۵ ملاحظہ ہو (Islam and Ahmadism.) شائع کردہ انجمن خدام الدین، لاہور

کہیں وجود نہیں"۔

مغربی مصنفین نے مصر کی فرنگیت کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے، مصنف نے بھی ان کے بعض اقوال نقل کئے ہیں، لیکن اب مصر کے حالات بدل رہے ہیں، ہوا کا رُخ اسلامیت کی طرف ہے ۱۹۲۲ء میں المنار ماہانہ کے سوا کوئی اسلامی رسالہ یا اخبار نہیں تھا، کوئی قابلِ ذکر اسلامی انجمن نہیں تھی، ادبی رسالے عربیت اور اسلامیت کے بدلے مصریت اور فرعونیت کے نعرے بلند کرتے تھے لیکن آج متعدد اخبار اور رسالے موجود ہیں، جمعیۃ الشبان المسلمین کا جال ملک کے گوشہ گوشہ میں بچھا ہوا ہے، محمد حسین ہیکل[1] جیسے "فرعونیت" کے علمبردار حیاۃ محمد (ص) اور فی منزل الوحی جیسی کتابیں لکھ رہے ہیں، احمد حسن الزیات کے ماہنامہ الرسالہ[2] (جو اس وقت سب سے اونچا ادبی رسالہ ہے) کا ہر سال ہجرت نمبر شائع ہوتا ہے، خلاصہ یہ کہ مصر عاجز کے مطالعہ کے مطابق تیزی سے عربیت اور اسلامیت کی طرف آرہا ہے، مصنف نے اس کی توضیح کما حقہ نہیں کی،

قومیت اور وطنیت کے متعلق ہم ڈاکٹر زکی علی کے خیال سے متفق ہیں، کہ عربی ملکوں میں وطنیت کی غلط تحریک اب اسلامیت سے ٹکر نہیں لے گی، یعنی ممالک عربیہ کی آزادی کے بعد اس کا پورا امکان ہوگا، کہ یہ حکومتیں ایک الگ مجلس اقوام میں شریک ہوں، مسلم حکومتوں اور قوموں میں اتنی پھوٹ نہیں جتنی مغربی اہلِ قلم بیان کرتے ہیں، خود یورپ کی بسنے والی قوموں میں کون سا جذبۂ اتحاد کار فرما ہے، ؟ شاید مظلوموں پر تعدی کے سوا کسی مسئلہ میں ان کا اتحادِ خیال دشوار ہو،

"سوسائٹی کی ساخت سیاسی خیالات اور دوسرے اعتبارات سے یورپ کے مختلف

[1] سابق ایڈیٹر السیاسۃ اور حال وزیر تعلیم، [2] الرسالہ اور اس کے سالانہ (ہجرت نمبر) کا مصنف نے بھی شاندار الفاظ میں ذکر کیا ہے۔ (ص ۱۹۲)

ملکوں کا باہمی اختلاف، اسلامی دنیا سے کہیں زیادہ بڑھا ہوا ہے، خصوصیت کے ساتھ اجتماعی اور ثقافتی خصوصیات اور عادات میں اسلام یورپ سے کہیں بڑھ چڑھ کر ایک وحدت کی حیثیت رکھتا ہے"، (ص ۱۹۱)

مختلف اصلاحی تحریکوں سے یہ غلط فہمی نہ ہونا چاہئے کہ ان کا رخ مذہب اور قرآن کی تعلیمات کے خلاف ہوگا، مصنف اس باب میں مطمئن ہیں، (ص ۳-۱۹۲) ہم گو مگو کے عالم میں حالات و واقعات کا مطالعہ کر رہے ہیں،

پہلے حصہ کے آخری باب (ص ۲۱-۱۹۵) میں "اسلام اور مغرب" کی کشمکش پر بحث ہے، اسلام کی ترقی اور اس کے حلقۂ اثر کی وسعت کے ساتھ ہی اسے "مسیحیت" سے نبرد آزما ہونا پڑا، "اسلام اور مسیحیت" کی اس دیرینہ کشمکش کو آج "اسلام اور مغرب" کے نزاع سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے، یہ کشمکش میدانِ جنگ تک محدود نہ تھی، زبان و قلم بھی اس معرکہ آرائی میں شریک ہوئے، اس سلسلہ میں یہ حقیقت خاص طور پر قابلِ لحاظ ہے کہ مسلمانوں نے تمام رد و کد میں حضرت عیسیٰؑ کی شخصیت کا احترام ہمیشہ ملحوظ رکھا، لیکن مغربی مسیحیوں نے نبی کریم (ص) کی ذات گرامی کو بھی اپنے اعتراضات کا نشانہ بنایا، اور نہ صرف اسی قدر بلکہ ناپاک اور گندہ بہتان طرازیوں میں بھی انھوں نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی،

صلیبی جنگوں کے دوران میں اور ان کے بعد مغرب کی یہ دشنام طرازیاں اور بڑھ گئیں، کلیسا والے گویا مسلمانوں کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کا عزم مصمم کر چکے تھے، پطرس راہب کی دعوت، عیسائی مقاماتِ مقدسہ کو "مشرکوں" کے قبضہ سے نکالنے کا عزم مصمم، مسلمانوں کے قاتلین کو جنت کی بشارت امراء کو نئے مقبوضات کی تلاش، مشرق کے بازار کی طرف تاجرانِ مغرب کی للچائی ہوئی نظریں، یہ اسباب تھے، جن کے ماتحت مسیحی مغرب، اسلام اور مسلمانوں کے خلاف از سرِ نو پھر معرکہ آرا ہوا، یہ تنفر اور

عداوت صلیبی جنگوں کے بعد بھی عرصہ تک باقی رہی (ص ۱۹۶) اور کون کہہ سکتا ہے، کہ آج بھی یہ چیز باقی نہیں ہے، ؟ لباس و وضع کی تبدیلی سے دلوں کی تبدیلی نہیں ہوا کرتی،

مغرب کی عداوت صرف مذہب اور مذہبیات تک محدود نہیں رہتی، ایک صدی پیشتر تک یہ حال تھا، کہ اسپین کی تاریخوں میں عربون کا دور نظرانداز کر دیا جاتا تھا،

مصنف نے اسلام اور نصرانیت کا بنیادی فرق اچھی طرح واضح کرنے کی کوشش کی ہے، نیز عیسائیوں کے ساتھ مسلمان بادشاہون کا حسن سلوک اور اس کی موٹی موٹی مثالین بھی دکھائی گئی ہیں، (ص ۲۰۲-۱۹۹) آرنلڈ پریچنگ آف اسلام ص ۸۸) اور بعض دوسرے افرنگی مصنفین کے حوالے سے مصنف نے سلطان صلاح الدین کے حسن سلوک کی متعدد مثالیں دی ہین، آرنلڈ نے یہان تک لکھا ہے کہ صلیبی مجاہدین کی وحشت و بربریت، اور صلاح الدین ایوبی کی انسانیت اور رواداری دیکھ کر خود صلیبی فوج کے افراد بہ کثرت حلقہ بگوش اسلام ہو گئے، ایک طرف اندلس مرحوم میں عربوں کے اخراج کے بعد باقی ماندہ لوگوں کے ساتھ شیدائیان مسیح کا برتاؤ ہے، دوسری جانب جنگ صلیبی کے بعد، صلاح الدین اور ان کے جانشینوں کا حسن سلوک، مسیحی عبادتخانوں اور فلسطین کے عیسائی باشندوں کے ساتھ ہے' دور جانے کی ضرورت نہیں، دونون کے نتائج آنکھوں کے سامنے ہیں، آج اسپین کو ہم اندلس مرحوم کہہ کر پکارتے ہیں، اور وہان مسلمان کا نام و نشان باقی نہیں، اس کے برخلاف فلسطین میں تمام گرجے اور معابد انگریزی بربریت کا منظر دیکھنے کے لئے صحیح و سالم موجود ہیں، تمام عیسائی خانقاہیں، مختلف فرقے ارتھوڈکس جن کا یورپ مین نام و نشان مٹا دیا گیا، آج فلسطین مین ایوبیوں اور عثمانیون کے دور عدل و انصاف کی داد دینے کے لئے موجود ہیں، یہی نہیں، بلکہ وہ آج اپنے مسلمان بھائیوں کے دوش بدوش خود یورپ کے عیسائیوں کے خلاف نبرد آزما ہین،

دنیا کی بدنصیب اور مفسد قوم یہود پر مسلمان فرمانرواونکے احسانات ان گنت ہیں، مصر شمالی افریقہ، اور دوسری اسلامی حکومتوں میں انھیں کافی اعزاز و رسوخ حاصل تھا، مسلمان جہاں پہنچے ان کے لئے نوید بشارت لیکر گئے، عیسائیوں کی غلامی سے انھیں نجات ملی، لیکن قدرت کا تماشا دیکھئے، آج وہ بھی جان کے گاہک ہیں، آل عثمان کی مملکت میں یہود کو جو سہولتین اور امتیازات حاصل تھے، ان کا تفصیلی تذکرہ کتاب میں موجود ہے، (ص ۶-۲۰۵)

یہ تو عہد قدیم اور قرون وسطیٰ کی باتیں تھیں، یہ اس وقت کی داستان تھی، جب ہم کچھ تھے' اپنی مظلومیت کا دکھڑا اگر سُنایا جائے، تو رات بیت جائے، پر افسانہ ختم نہ ہو،

"مغرب کی تین پرانی یورشیں قدمیوں (اسکندر، روم، صلیبی) کے بعد، اب چوتھی بار یورپ موجودہ زمانہ میں حملہ آور ہوا ہے، یہ حملہ بہت وسیع، مسلسل اور دوررس ثابت ہوا ہے' ولندیزیوں (ڈچ) اور پرتگالیوں کی مذہبی اور تجارتی کوششون کے نقش قدم پر، فرانس، انگلستان، اور روس تینون تین صدیون سے ایک سہ گانہ مہم کی تکمیل میں لگے ہوئے ہیں، پہلے مذہبی تبلیغ، پھر تجارتی ترغیب، اس کے بعد مسلح دست برد یا قبضہ"

(ص ۲۰۶)

سو برس سے یہ حملہ زیادہ سخت اور جارحانہ ہو چکا ہے، اس میں شک نہیں، کہ اب مشرق کی اسلامی آبادی بیدار ہو چکی ہے، لیکن مشرق کے بیدار ہوتے ہوتے تمام مقبوضات کے حصے بخرے ہو چکے تھے، اور تو اور، بیسوین صدی کے آغاز میں ترکی، ایران، اور افغانستان، معاشی منطقون (ZONES) میں تقسیم ہو چکے تھے،

کتاب کے دوسرے حصہ میں مصنف نے مسلمانون اور مشرق کی بیداری، نیز موجودہ حالات پر سیر حاصل بحث کی ہے، اسلئے یہان اسکو چھیڑنے کی ضرورت نہیں، اس باب میں فاضل مصنف نے مغربی

استیلا، کا تاریخی تجزیہ کیا ہے، جو قابلِ مطالعہ ہے، فرانس، انگلستان، اطالیہ نے اپنی سیاسی برتری کے تحفظ کی خاطر جو تعلیمی مہم جاری کی اس پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، اور جو کچھ لکھا گیا ہے، مستند بیانات اور واقعات کی روشنی میں (ص ۲۰۹-۲۱۰) اقتصادی دباؤ کے چہرہ سے بھی نقاب ہٹائی گئی ہے (ص ۲۱۲) تمدن کے نام پر مغربی قوموں نے جو انسانیت سوز مظالم روا رکھے ہیں، ان پر بھی گہری نظر ڈالی گئی ہے۔ (ص ۲۱۴)

خلاصہ یہ کہ مصنف نے اخباری زبان میں مغرب کا تار و پود بکھیر کر رکھدیا ہے، جگہ کی تنگی کے باعث اقتباسات نہیں دیئے جا سکتے، آخر میں مصنف نے یورپ کو ایک تنبیہ کی ہے جو ہم انہی کے الفاظ میں پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں:۔

"مغرب کا تاثر اسلام کے متعلق واضح اور صحیح ہونا چاہئے، اسے اسلام کے بنیادی مقاصد جاننا اور سمجھنا چاہئیں، اسے جاننا چاہئے، کہ اسلام ایک "عقیدہ" کا مذہب ہے، اسلئے عمل کا" اور عقل کا مذہب ہے، اسلئے صداقت کا اور فطرت کا مذہب ہے، اسلئے آزادی کا اور علم کا مذہب ہے اسلئے ترقی کا اور اقتدار کا مذہب ہے، اسلئے انضباط کا اور ایقان کا مذہب ہے، اسلئے شدتِ عمل کا اور (جسے یورپ میں خواہ مخواہ "وحشت" (Fanaticism) کہا جاتا ہے) اخوت کا مذہب ہے، اسلئے مساوات کا اور اتحاد کا مذہب ہے، اسلئے انسانیت عامہ کا اور اللہ کی قدرت پر اعتماد کا مذہب ہے اس لئے سکون کا بھی ہے، اور یورپ کو یہ حقیقتیں جاننا اور ذہن نشین کرنا چاہئیں" (ص)

ہم نے قصداً اصل انگریزی اسلوب بیان کی تقلید کی ہے، تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ مصنف نے جو کچھ لکھا ہے وہ علم کیساتھ ساتھ عقیدت اور ولولہ سے لکھا ہے، اور سچ پوچھئے، تو یوں کہنے کو جو کچھ کہا جائے لیکن عقیدت اور ولولہ کے بغیر تحریریں جان نہیں پیدا ہوتی،

کتاب کا پہلا حصہ یہاں ختم ہو جاتا ہے، دوسرے حصہ میں کل چار باب ہیں:۔

۱- (دنیائے) اسلام کی موجودہ بیداری، ص ۲۲۱-۲۵۳،

۲- (دنیائے) اسلام کی آزادی، ص ۲۵۵-۲۵۹،

۳- اسلام اور بین الاقوامی معاملات، ص ۳۶۱-۲۶۸،

۴- دنیا میں اسلام، ص ۳۶۹-۴۱۰،

گذشتہ ابواب میں پوری اسلامی تاریخ پر تبصرہ تھا اس حصہ میں صرف موجودہ حالات پر بحث ہے، اور معلومات کے تنوع کے لحاظ سے یہ حصہ کتاب کی جان ہے، گو پہلے حصہ کے بعض ابواب بھی بہت قیمتی ہیں،

اس سلسلہ میں سب سے پہلے موجودہ بیداری کی تفصیل کی گئی ہے، یوں تو جنگ عظیم سے پہلے دنیا کے مسلمان خوابِ غفلت سے بیدار ہو چکے تھے، لیکن اس کے نتائج جنگ کے بعد ظاہر ہوئے عثمانی حکومت کے کھنڈروں پر متعدد مستحکم اسلامی حکومتوں کی دیواریں کھڑی ہو گئیں، اور جو پابند قفس رہ گئے، وہ بھی رہائی کی ہر ممکن کوشش عمل میں لا رہے ہیں،

ترکی جنگ کے بعد ایک متجانس (Homogeneous) مستحکم حکومت کی شکل میں نمودار ہوئی، ایران، روس اور برطانیہ کی چشمک سے آزاد ہو کر مستقل آزاد سلطنت کا مالک ہے، روس اور برطانیہ کی بازگاہ افغانستان بھی اپنی آزادی حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکا ہے، وہابی فرمانروا ابن سعود کے زیر اثر عرب کا علاقہ بھی آج حیات نو حاصل کر کے شاید ہزار برس کی زبون حالی کے بعد دنیا کی سیاست میں اہمیت حاصل کر رہا ہے، عراق ایک آزاد دستوری حکومت بن چکا ہے، مصر بھی آخر پچاس سال کی برطانوی غلامی کے بعد آزاد حکومت بن کر رہا، شام اور فرانس میں سمجھوتہ ہو چکا ہے، اور عنقریب شام کو

آزادی[1] کا پروانہ مل جائے گا، یمن بالکل آزاد ہے، اور البانیہ بھی قاعدہ کے لحاظ سے استقلال کا مالک ہے، فلسطین اپنی آزادی کی حصول کی خاطر بیش از بیش قربانیاں پیش کر رہا ہے، شمالی افریقہ میں بھی قومی تحریک روز بروز زور پکڑتی جا رہی ہے،

(ص ۲۲۱-۲۲۲)

یہ بیداری صرف قومی یا سیاسی نہیں ہے، بلکہ ذہنی، اجتماعی، معاشی اور مذہبی زندگی کے تمام شعبوں تک اس کا اثر پھیلا ہوا ہے، تمام دنیائے اسلام اس وقت ایک تغیر کے عالم میں ہے، اور یہ تبدیلی مشرق قریب میں زیادہ سرعت کے ساتھ عمل میں آ رہی ہے، مصنف نے اس باب میں مشرق قریب کی مختلف تحریکوں کا جائزہ لیا ہے، اونھوں نے نمونہ کے طور پر مشرق قریب کا انتخاب کیا ہے، اور راقم الحروف کے خیال میں اتنی تفصیلی معلومات ہندوستان اور چین وغیرہ کے متعلق انھیں ہو بھی نہیں سکتی تھیں، بہرحال عربی ممالک کی تمام ادبی و اجتماعی و دینی تحریکوں اور بیداری کے ہر شعبہ پر نظر ڈالی گئی ہے، البتہ سیاسی ارتقاء کی بحث آیندہ باب کے لئے خاص کر دی گئی ہے،

عربی ممالک کی بیداری کے سلسلہ میں مصر کو بجا طور پر قیادت کا فخر حاصل ہے، مصری اخبارات اور مطبوعات سے پوری عرب آبادی متاثر ہوئی ہے، مراکش، الجزائر، تونس، طرابلس، سوڈان، زنجبار، حبشہ، حجاز، یمن، عراق، شام، عدن، نزدیک و دور جہاں بھی عربی بولنے والے بستے ہیں، مصری اخبارات اور مصری تحریکوں کے اثرات وہاں محسوس طور پر نظر آئین گے، ۱۹۳۵ء میں مصر میں سیاسی ہیجان کا پیدا ہونا تھا کہ شام میں آگ لگ گئی، اور ابھی شام کا مسئلہ طے بھی نہیں ہوا تھا،

[1] سمجھوتہ تو واقعی ہو چکا تھا، اور مصنف کی طرح ہر شخص کو یقین تھا، کہ مصر و عراق کے درجہ کا معاہدہ ضرور ہو جائیگا، لیکن آخری اطلاعات یاس انگیز معلوم ہوتی ہیں، ابھی قطعی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا، ممکن ہے شام کے غیور باشندوں کو ایک دفعہ اور زور آزمائی کرنا پڑے،

کہ فلسطین نے آخری طور پر جان کی بازی لگا دی، مراکش میں از سر نو زندگی پیدا ہوئی، اور اب طرابلس میں پھر احساس پیدا ہو رہا ہے،

وحدت عربیہ کی تحریک اب خواب نہیں رہی فلسطین کے سلسلہ میں عربی حکومتیں اور عرب جس طرح ایک قوم بن گئے ہیں، اس کی مثال کم از کم ہندوستان تو پچاس سال تک پیش نہیں کر سکتا، مصر نے فلسطین کے سلسلہ میں بھی قیادت کی باگ اپنے ہاتھوں میں رکھی ہے

اقتصادی تحریکوں میں بھی مصر پیش پیش ہے، مصری بنک کی سرگرمیاں اب آس پاس کے عربی علاقوں میں بھی پھیل رہی ہیں، کوثر اور زمزم نامی جہاز مصری حاجیوں کے لئے تیار کر لئے گئے ہیں، اور پچھلے دو برس سے تو مصری بنک اور اس کے بانی طلعت حرب پاشا، حجاز، اور اسی طرح پورے دنیائے اسلام کی مفید خدمات انجام دیرہے ہیں،

مصر میں کسانوں اور مزدوروں کی تنظیم اور ان کی مستقل فلاح و بہبود کی کوششیں بھی ہو رہی ہیں، اور اس کے اثرات تمام عربی ملکوں میں محسوس کئے جا رہے ہین، (ص ۲۲۹)

مصنف نے ادبی تجدد اور ترقی پر بھی سیر حاصل گفتگو کی ہے، جو عام طور پر انگریزی اور اردو جاننے والوں کیلئے ایک نئی چیز ہے،[1]

اسلامی ادبیات کے سلسلہ میں ڈاکٹر زکی علی نے یہ بالکل صحیح لکھا ہے، کہ عربی، فارسی اور ترکی زبانیں، گو مختلف خاندانون (عربی سامی زبان ہے، اور فارسی آرین یا انڈو یوروپین) سے تعلق رکھتی ہیں لیکن اسلام کے اثرات سب پر ہیں"، (ص ۲۳۳)

البتہ یہ اثر اب ایران کی جدید ادبیات میں بہت کم نظر آتا ہے، وہاں اب ایران کے پرانے

[1] عربوں کی قومی تحریک کے سلسلہ میں ہم نے ادبی تجدد پر بھی روشنی ڈالی ہے، ملاحظہ ہو (مدینہ جولائی ۳۷ء) اس کتاب میں معلومات اس سے زیادہ ہین،

بادشاہوں (قبل اسلام) کا کلمہ پڑھا جاتا ہے، عربی اب تک دنیائے اسلام کی مذہبی زبان باقی ہے، لیکن ترکی سے عربی الفاظ کے اخراج نے عربی کی بین الملی حیثیت گھٹا دی ہے، (ص ۲۳۳)

مصنف نے عربی ادبیات عموماً اور مصری ادب پر خصوصاً پوری روشنی ڈالی ہے، اور تمام پہلوؤں کو اچھی طرح اجاگر کیا ہے، طوالت کا خوف مزید اقتباس دینے سے مانع ہے،

(ص ۲۲۹-۲۳۷)

مصنف نے طبعی طور پر مصر کی ادبی و ذہنی قیادت اور قاہرہ کی بین الملی حیثیت پر بہت زور دیا ہے، اور مختلف مثالوں سے مصر کی مرکزیت ثابت کرنے کی کوشش کی ہے جس میں وہ پوری طرح کامیاب ہیں، (۹-۲۳۰) اس میں کوئی شک نہیں کہ جہاں تک ذہنی اور ادبی پیداوار کا تعلق ہے، مصر سب سے آگے ہے، اور مصر کی اچھائیاں اور برائیاں یکساں طور پر عربی علاقوں پر اثر انداز ہوتی ہیں، اس کی معمولی مثال یہ ہے، کہ حجاز اب تک صحافت میں کورا تھا، اب جو وہاں نوجوانوں کو شوق پیدا ہوا، تو وہی مصری معمولی رسالوں کی تقلید، وہی ادب لطیف (؟ یا کثیف) مہمل قصے یورپ اور جاپان کی تمام خبریں، لیکن ہندوستان اور چین کے متعلق ایک حرف بھی نہیں،.....

مدینہ منورہ سے المدینۃ شائع ہوتا ہے، لیکن اس میں آقائے مدینہ (روحی فداہ ؐ) کی بتائی ہوئی تعلیمات کا کہیں پتہ نہیں!! شکر ہے کہ مصر کو اپنی زعامت اور اسلامیت کا احساس پیدا ہو چلا ہے، اگر یہ رفتار قائم رہی تو ان شاء اللہ اس کے نتائج اچھے ہوں گے، بہر حال اس سے مصر کی مرکزیت اور قاہرہ کے ("Metropolis") ہونے میں کوئی فرق نہیں آتا،

عربی کے ساتھ فارسی (۲۴۰-۲۴۳) اور ترکی (۲۴۳-۲۴۵) ادبیات کی تاریخ، اور موجودہ رفتار پر بھی اجمالی مگر غائر نظر ڈالی گئی ہے لیکن افسوس کہ اسلامی ادبیات کے سلسلہ میں ہماری (اردو) کا ذکر نہیں کیا گیا، گو یہ عربی کی طرح مالدار نہیں لیکن کم از کم ہندوستان کے مسلمانوں کی ذہنی حالت

کا صحیح اندازہ اردو ادبیات کے مطالعہ کے بغیر نہیں ہو سکتا، ہم نے یہ حقیقت عربی اخبارات میں بار بار ظاہر کی ہے، اور کوشش کریں گے، کہ مصنف تک اپنی شکایت پہونچائیں، تاکہ دوسرے ایڈیشن میں اردو کی حق تلفی نہ ہو، مصنف اس باب میں معذور تو ضرور تھے لیکن اگر انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کا (اردو) والا مقالہ بھی وہ پیش نظر رکھتے، تو کچھ نہ کچھ لکھ سکتے تھے،

نسوانی تحریک کی ترقی اور وسعت کا ذکر بھی شاندار الفاظ میں آیا ہے، (ص ۲۴۵-۲۵۰) اس میں ترکی عورتوں کی آزادی اور بیداری کے گن گائے گئے ہیں، مصری خواتین کی بیداری بھی معرض بحث میں آئی ہے، فرق یہ بتایا گیا ہے کہ مصر کی تحریک اسلامی روایات سے وابستگی بھی قائم رکھے ہوئے ہے، (ص ۲۴۷) لیکن ہمیں یہ وابستگی کہیں نظر نہیں آتی، جو اسلامی قوانین موجود ہیں، وہ حکومت کی نگاہ کرم کا نتیجہ ہیں، عریانی، مخلوط تعلیم، مردانہ طرز تمدن، اور مغربی تہذیب کی تمام خرابیاں مصر میں نظر آتی ہیں، البتہ اب اس تباہ حالی سے عورتیں خود گھبرا اٹھی ہیں، اور اسکا رد عمل پیدا ہو رہا ہے، اور نہیں کہا جا سکتا، کہ آیندہ اس کا رخ کدھر ہوگا،؟

نوجوانوں کی بیداری اور ساتھ ساتھ تفرنج، یا "مغرب زدگی" کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے، لیکن مصنف کو یقین ہے کہ مذہب کی راہ سے وہ الگ نہیں ہوں گے، (ص ۴-۲۵۰)

اسلامی ملکوں کی بیداری کی تفصیل کے بعد ہر ملک پر الگ الگ نظر ڈالی گئی ہے، اور دنیائے اسلام کی آزادی (ص ۲۵۵-۳۵۹) پر مفصل بحث کی گئی ہے، ترکی سے لیکر ہر چھوٹے بڑے علاقہ کی سرگذشت بیان کی گئی ہے، اس مضمون کی محدود گنجایش میں ہمارے لئے ایک اجمالی تبصرہ کافی ہوگا، مصنف کے بیان کی تلخیص میں کہیں کہیں ضروری اضافہ اور معلومات کی تصحیح کر دی گئی ہے،

ترکی (ص ۲۵۵-۲۶۴)

عثمانی حکومت کا زوال دنیا کی تاریخ کا عظیم الشان واقعہ ہے، نئی جمہوریت کی داغ بیل

قومیت، صنعت، اور لادینیت (Secularism) کی بنیاد دن پر رکھی گئی، ۳ مارچ
۲۴ء الغاے خلافت کا دن ترکی کی تاریخ میں "نقطۂ انحراف" کی حیثیت رکھتا ہے، اس کے
بعد مذہبی مدرسوں اور منصب قضا کی باری آئی، ساتھ ساتھ اوقاف کی ضبطی عمل میں آئی، چند مہینوں
کے بعد (پہلی دسمبر ۲۵ء) ترکی ٹوپی کا پہننا جرم قرار پایا، اس کے بعد "درویشوں" کی جماعت خلاف
قانون قرار پائی، اور اس سلسلہ میں ۳ دسمبر ۳۴ء کا قانون بھی قابل لحاظ ہے جس کی رو سے مذہبی
لوگوں کو رسوم کی ادائگی کے علاوہ خاص لباس پہننے کا اختیار نہیں رہا،

الغاے خلافت کے بعد دوسرا اہم قدم ۲۴ مئی ۲۸ء کو اٹھایا گیا، لاطینی رسم الخط کا استعمال
جبری قرار دیا گیا (پہلی جنوری ۲۹ء) مصنف کے بیان کے مطابق اس سے خواندگی کا اوسط بڑھ
گیا، گو عربی اخبارات یہ ظاہر کرتے ہیں، کہ اس سے لکھنے پڑھنے والوں کی تعداد گھٹ گئی ممکن ہے
یہ تبدیلی کا فوری اثر رہا ہو، ترکی کی موجودہ تعلیم ایک نظام کی پابند (یعنی تعلیم کا سارا نظام حکومت کے
ہاتھ میں ہے) اور مخلوط ہے، ایک اچھی بات یہ ہوئی، کہ لادینیت کے پروگرام کے نفاذ کے ساتھ
ساتھ غیر ملکی مشنریوں کی راہ بھی روک دی گئی، ۹ اپریل ۲۸ء کو دستور میں ایک اہم تبدیلی ہوئی،
جسکے ذریعہ دستور سے مندرجۂ ذیل فقرہ حذف کر دیا گیا،

"ترکی حکومت کا مذہب اسلام ہے"

اسلامی قانون کے بدلے ایک مغربی قانون (جو فرنچ، سوئس، جرمن، اور لاطینی قوانین
پر مبنی ہے) پر عمل درآمد شروع ہوا، عورتوں کی حیثیت بالکل بدل گئی، تعداد ازدواج ممنوع
قرار پایا، سول میرج ضروری ہوگیا، پردہ کا رواج صرف پروپگنڈا سے ختم ہوگیا، عورتوں
کو تمام سرکاری ملازمتوں میں جگہ دی گئی،

یہ مذہبی اور اجتماعی اصلاحات کی ایک مختصر فہرست ہے، جو مصنف نے بلا کسی اظہار رائے

کے پیش کر دی ہے، ہم بھی اس پر اظہار خیال کرنا نہیں چاہتے، صرف اتنا عرض کر دینا نامناسب
نہ ہوگا، کہ ہمیں ان اصلاحات کو شریعت کی کسوٹی پر رکھ کر جانچنا چاہئے، یہ بیانات کسی مغربی
مصنف کی خیال آرائی کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک "ماڈرن" مسلمان نے جو ترکوں سے محبت رکھتا ہے
یہ معلومات فراہم کی ہیں،

اجتماعی اور ثقافتی اصلاحات کے ساتھ ساتھ ملک کی اقتصادی خوش حالی کا خیال بھی برابر
پیش نظر رہا، بنکوں کے نظام کی تجدید کی گئی، انھیں غیر ملکی اثرات سے نکال لیا گیا، ۳۳ء میں
ایک پنجسالہ اسکیم کی طرح ڈالی گئی،

سیاسی اعتبار سے ہمسایوں کے ساتھ ترکی کا رویہ دوستانہ رہا، روس سے دوستانہ
روابط استوار کئے گئے، (لیکن اشتراکیت کی تبلیغ حدود مملکت میں سختی کے ساتھ ممنوع ہے)
۲۵ء میں روس سے معاہدہ ہوا، اور ۲۹ء، ۳۰ء، ۳۶ء میں اسکی تجدید ہوتی رہی، فرانس
سے ترکی شامی حدود پر پھر نظر ثانی کرائی گئی، ۳۰ء میں یونان سے معاہدہ ہوا، اکتوبر ۳۱ء
میں یونان کے پایہ تخت اتینا میں ترکی وزرا کا شاندار استقبال ہوا، ۳۳ء میں میثاق بلقان کی
تکمیل ہوئی، اور ۱۸ جولائی ۳۲ء کو مجلس اقوام کی ممبری بھی حاصل ہوگئی، یہی نہیں، بلکہ مصر کے
مجلس اقوام کو داخلہ کے موقع پر ترکی وزیر خارجہ نے جلسہ کی صدارت کی، ایشیا میں بھی ترکی کے
تعلقات ہمسایوں کے ساتھ دوستانہ ہیں، البتہ سنجق (اسکندرونہ) کے معاملہ کی وجہ سے شام
(سوریا) سے کشیدگی پیدا ہوگئی ہے، اس حسن معاملہ اور دوستانہ مراسم کی تصدیق کے لئے
دول اربعہ کا معاہدہ (میثاق اسعد آباد) کافی ہے، جولائی ۳۶ء میں ترکوں کو درۂ دانیال
کی قلعہ بندی کی اجازت مل گئی،

جب توقع ہی اٹھ گئی تو پھر گلہ کیسا، ورنہ فلسطین کے مسئلہ پر ترکی کی خاموشی اور (سنجق

پر دست اندازی کے متعلق کچھ عرض کیا جاتا، جب تک (زنخ) کا علاقہ فرانس کے قبضہ میں رہا، کمالی حکومت خاموش رہی، جونہی معاہدہ کا اعلان ہوا، اور شام کی خود مختاری کی توقعات پیدا ہوئیں، رگ حمیت پھڑک اٹھی، اور پھر آج جو کچھ اسکندرونہ اور انطاکیہ میں ہو رہا ہے، اسکی تفصیل عربی اخبارات میں پڑھنے سے عبرت ہوتی ہے،

آزاد مصر (ص ۲۶۴ – ۲۸۰)

مصر عرصۂ دراز سے ترکی حکومت کا ایک حصہ تھا، ۱۸۸۲ء سے ۱۹۱۴ء تک برطانوی اقتدار کے باوجود یہاں عثمانی حکومت کا نام باقی رہا، کچھ عرصہ تک فرانس اور برطانیہ میں رقابت رہی، ۱۹۰۴ء میں فرانس قطعی طور پر برطانیہ کے حق میں دست بردار ہو گیا، برطانوی حکام ہمیشہ کہتے رہے کہ یہ تسلط عارضی ہے لیکن ۱۹۱۴ء تک برطانوی اقتدار حسب دستور قائم رہا، اور ملک میں بیداری اور قومی تحریک بڑھتی رہی،

۱۹۱۴ء میں برطانیہ اور عثمانی حکومت کی باہمی چھیڑ چھاڑ کے شروع ہوتے ہی، برطانیہ نے مصر پر اپنے قبضہ کا اعلان کر دیا، عباس حلمی دوم، خدیو مصر (جو اس وقت استانبول میں تھے) معزول کئے گئے، اور ان کی جگہ ان کے چچا فواد تخت و تاج سے نوازے گئے، اور وعدہ کیا گیا کہ جنگ کے بعد تمام مقبوضات کو خود مختاری حاصل ہو جائے گی، جنگ کے خاتمہ پر اہل مصر نے ایفائے وعدہ کا مطالبہ کیا، لیکن بے سود، ملک میں بے چینی بڑھی، اور وفد کے رہنما سعد زغلول نے پیرس کی صلح کانفرنس میں مصر کی نمایندگی کا پرزور مطالبہ کیا، اسکے جواب میں سعد زغلول اور ان کے چند رفقا گرفتار کرکے مالٹا بھیج دیئے گئے، ملک میں انقلاب اور بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی، ۱۹۱۹ء کا انقلاب اتنا ہمہ گیر اور پرزور تھا، کہ اس کے فرو کرنے کے لئے جنرل النبی (Allenby) کے زیر قیادت ساٹھ ہزار مسلح فوج کو میدان میں آنا پڑا،

پھر سعد زغلول رہا ہوئے، اور لارڈ ملنر کی صدارت میں ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر ہوا، اہل مصر

نے اس کا مکمل بائیکاٹ کیا، ملنر کو تسلیم کرنا پڑا کہ "مصر کا قومی جذبہ دبایا نہیں جا سکتا"، لیکن کمیشن کی سفارشات مطالبات سے بہت کم تھیں اس سے قوم نے بیزاری ظاہر کی، دوبارہ تحریک اٹھی، اور پھر النبی کی خدمات حاصل کرنی پڑیں، سعد زغلول جبرالٹر بھیج دئے گئے، ۲۸ فروری ۱۹۲۲ء کو برطانیہ نے مصر کو ایک آزاد حکومت تسلیم کیا، لیکن فوج، امتیازات، سوڈان اور نہر سویز کے بارے میں ایسی تحفظات رکھی گئیں، جو مصریوں کے لئے قابل قبول نہیں ہو سکتی تھیں، ان تحفظات کا مسئلہ تو طے نہ ہو سکا، لیکن ایک جمہوری دستور کا حق عطا ہوا، (۱۹۲۳ء) اس دستور کے مطابق ۱۹۲۴ء میں نئی پارلیمنٹ کے انتخابات ہوئے، وفد کو اکثریت حاصل ہوئی، اور سعد زغلول (جو جلا وطنی سے واپس آچکے تھے) کی سرکردگی میں وزارت کی تشکیل ہوئی، اور معاہدہ کا مسئلہ از سر نو چھیڑا، چند مہینوں کی تگ و دو کے بعد گفت و شنید ناکام ثابت ہوئی،

نومبر ۱۹۲۴ء میں سرلی اسٹیک (Lee Stack) سوڈان کا گورنر جنرل قاہرہ میں مارا گیا، انگریزوں نے سخت تادیبی کارروائی کرنا چاہی، حکومت سے باضابطہ معافی کے مطالبہ کے علاوہ مجرموں کی تعزیر، سیاسی مظاہروں کا بند کرانا، اور دس لاکھ پونڈ کے تاوان کا مطالبہ کیا گیا، وفدی وزارت نے مجلس اقوام سے دادرسی چاہی، اس پر سکرٹری وزارت خارجہ، مسٹر چمبرلین نے ایک ڈانٹ بتائی... اور ۱۹۲۳ء کا دستور درد کی دوا نہ بن سکا،

۱۹۲۸ء میں چمبرلین نے ثروت پاشا وزیر اعظم (جنھون نے ایک مشترک وزارت کی تشکیل کی تھی) سے معاہدہ کی گفتگو کی، پھر مسٹر ہنڈرسن سے محمد محمود پاشا سے ۱۹۲۹ء میں، اس کے بعد نحاس پاشا سے بھی گفتگو جاری رہی، لیکن وزارت عظمی کے یہ تینوں مسند نشین لندن سے خالی ہاتھ واپس آئے، نہر سویز، سوڈان، امتیازات، فوجی قبضہ کے متعلق برطانیہ قومی مطالبات ماننے پر راضی نہیں ہوا، مگر انگریزی

فوجوں کا قاہرہ کی سڑکوں پر شان حکومت کے ساتھ گھومتے پھرنا مصریوں کو کس طرح گوارا ہو سکتا تھا، غیر ملکیوں کے امتیازات کا دنیا کے کسی خطہ میں وجود باقی نہیں رہا، دوسرے ملکوں کے باشندے مصر میں رہیں، پیسے کمائیں، لیکن ان پر کوئی ٹیکس عائد نہ ہو، اس سے زیادہ کیا بیہودگی ہو سکتی ہے، ؟ ان کے مقدمات فیصل کرنے کے لئے الگ مخلوط عدالتیں مقرر تھیں، سوڈان پر صرف مصر کا ہو، اور انھیں کوئی اختیار نہیں، سنہ ۳۰ء میں وفدیوں کے استعفار کے بعد صدقی پاشا کی آمریت کا دور دورہ ہوا، قصر شاہی کے اثرات بھی بڑھ گئے، سنہ ۲۳ء کا دستور یکلخت منسوخ کر دیا گیا، اور چند سال تک استبداد کا بازار گرم رہا، .... بالآخر نومبر سنہ ۳۴ء میں توفیق نسیم پاشا نے قلمدان وزارت سنبھالا، اور دستور کی واپسی کا مطالبہ شروع ہوا انہی دوران میں سر صموئیل ہور کی تقریر نے (نومبر سنہ ۳۵ء) جس میں اس نے مصر کو دستور کے لئے نااہل قرار دیا تھا، ملک میں آگ لگا دی، آخر سنہ ۲۳ء کا دستور پھر نافذ ہوا، حبشہ پر اطالیہ کی تاخت نے برطانیہ کی انانیت بھی ذرا کم کی، نئے انتخابات میں وفد کو غلبہ حاصل ہوا، اور انہی کی زیر قیادت گفتگوے صلح تکمیل کو پہنچی، اور ۲۶ر اگست سنہ ۳۶ء کو لندن میں معاہدہ پر طرفین کے دستخط ہو گئے، اور سنہ ۲۲ء میں جن چار مسئلوں کے متعلق حکومت برطانیہ تحفظات چاہتی تھی، وہ سنہ ۳۶ء میں طے ہو گئے،

اس سمجھوتے میں گو فوجی قبضہ کے بارے میں برطانیہ ہی کا پلہ بھاری ہے، لیکن امتیازات کا مسئلہ گویا حسب خواہ طے ہو گیا، مونٹرو کانفرنس (اپریل سنہ ۳۷ء) میں تمام حکومتوں نے امتیازات سے دست برداری منظور کر لی صرف فرانس نے کچھ مخالفت کی تھی، سوڈان اور نہر سوئز کے متعلق مصر کے مطالبات کافی حد تک تسلیم کر لئے گئے، ۲۶ر مئی سنہ ۳۷ء کو مجلس اقوام میں داخلہ بھی ہو گیا،

مصنف نے جولائی سنہ ۳۸ء میں یہ سرگذشت لکھی تھی، اس ڈیڑھ سال کے عرصہ میں اور اہم انقلابات

رونما ہو چکے ہیں، شاہ فواد کی وفات اور جوان سال فاروق کی تخت نشینی کے بعد قصر شاہی اور وفد کی چشمک نے نئی کروٹ لی، تاآنکہ زعیم وفد کی جلد بازی، اور بے تدبیری سے انکی وزارت ٹوٹ گئی، نئے انتخابات میں وفد کو شکست فاش ہوئی، مصطفےٰ نحاس خود ہارے، ان کے دست راست، بلکہ وفد کی جان قبطی وزیر، مکرم عبید کو ایک ازہری مولوی (عبد الوہاب سلیم) نے شکست فاش دی، نئی وزارت میں پہلے پہل ایک صحافی (حسین ہیکل ایڈیٹر السیاسۃ) اور ایک متدین پروفیسر (مصطفےٰ عبد الرزاق استاذ فلسفہ جامعہ فؤاد الاول) کو جگہ دی گئی، صحافی کو وزارت تعلیم اور پروفیسر کو وزارت اوقاف سے نوازا گیا، شاہ فاروق کو ملک میں عجیب و غریب ہر دلعزیزی پیدا ہو گئی، اور ہو رہی ہے، مصطفےٰ المراغی ازہر کے جذبۂ اقتدار کی خاطر، اور عبد الحمید سعید (صدر جمعیۃ الشبان المسلمین) اسلامیت کی فضا پیدا کرنے کی غرض سے اپنی پوری قوت شاہ فاروق کی ہر دلعزیزی کے لئے صرف کر رہے ہیں، جوں جوں وفد کی قوت گرے گی، فرعونیت[1] اور دہریت کا اقتدار کم ہو گا، نیز قصر کے اقتدار کے ساتھ ساتھ وفد کا جھنڈا سر بلند نہیں رہ سکتا، بہرحال یہ تبدیلی اس منزل میں ہے، جہاں قطعی فیصلہ کرنا ذرا دشوار ہے،

فلسطین کا مسئلہ (ص ۲۰۱-۲۹۰)

ترکی اور مصر کی طرح مصنف نے فلسطین کی جد و جہد پر بھی روشنی ڈالی ہے، اردو میں اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، اور شرح و بسط کے ساتھ، اسلئے یہاں لکھی ہوئی چیز کے اعادہ

---

[1] "فرعونیت" کی تحریک کا مقصد قدیم مصر (پراچین بھارت کے نمونہ پر) کی تہذیب کا احیا ہے، "عربیت" اور "اسلامیت" سے قطع تعلق اس کی پہلی منزل ہے، شکر ہے، کہ اب یہ تحریک بہت کمزور ہو رہی ہے، اس کا سب سے بڑا سبب محمد حسین ہیکل ایڈیٹر "السیاسۃ" "آج (حیاۃ محمد) اور (فی منزل الوحی) کا مصنف ہو کر وزیر تعلیم بن چکا ہے، اب وہ ایک حد تک "اسلامیت" کا علمبردار ہے،

کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی، (ملاحظہ ہو مدینہ ۲۸ و ۳۱ جولائی ۳۷ء اور ۱۳ و ۱۷ نومبر ۳۸ء)

شام (ص ۲۹۰-۲۹۷)

شام پر فرانسیسی انتداب کی ابتدا ۲۰ء میں دمشق پر قبضہ سے ہوئی، انتدابی حکومت نے "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کے اصول پر پہلا یہ کام کیا، کہ شام کے پانچ حصے کر دیئے، (۱) جمہوریہ لبنان (۲) جبل الدروز (۳) علویین کا علاقہ، (۴) لاذقیہ اور انطاکیہ کے اضلاع (۵) شام کا باقی ماندہ علاقہ، حکومت سوریہ کے نام سے، فلسطین کو چھوڑ کر پورے شام کی آبادی تیس لاکھ سے زیادہ ہے، اس پر پانچ پانچ خود مختار ریاستیں!!! اللہ کی شان ہے،

انتداب کا پہلا دور جنرل گورو کی حکومت سے شروع ہوا، گورو ساڑھے تین سال حاکم رہا، اور اسی نے ۲۰ء میں جمہوریہ لبنان کے نام سے الگ حکومت قائم کرائی، اس کے جانشینوں نے پوری پانچ حکومتیں قائم کرکے چھوڑیں، موجودہ ہائی کمشنر کی خواہش تھی، کہ پانچ کی جگہ چھ یا آٹھ حصے کر دیئے جائیں، ۳۰ جنوری ۳۶ء کو حکم بھی نافذ ہو چکا تھا، اسی بنا پر شام میں پچاس روز مسلسل ہڑتال رہی، جس کے آگے سردست فرانسیسی اقتدار کو جھکنا پڑا، فرانسیسی بے عنوانیوں کی وجہ سے قومی تحریک برابر زور پکڑتی رہی، قومی جوش اور یک جہتی کا سب سے بڑا مظاہرہ ۲۵ء کے دروزی جہاد[1] میں ہوا، فرانسیسی تہذیب بھی اس ہنگامہ میں بالکل عریاں ہو گئی، چھتیس گھنٹے مسلسل دمشق پر گولہ باری ہوئی، (۱۸-۲۰ اکتوبر ۲۵ء) اقتصادی لحاظ سے بھی شام دور انتداب میں بہت تباہ ہوا، بعض اوقات ستر ستر ہزار فوج ملک میں رکھی گئی، ایک چھوٹا سا علاقہ اتنی بڑی فوج کس طرح برداشت کر سکتا تھا، ؟

شام کا مطالبہ آزادی کا تھا، عراق کے معاہدہ کے بعد اسی نمونہ پر ایک دوستانہ معاہدہ

[1] دروزی جہاد کی مکمل تفصیلات امین سعید کی (الثورۃ العربیۃ الکبری) میں پڑھئے، مطبوعہ مصر، تین ضخیم جلدوں میں،

کا مطالبہ ہوا، جو آخر ۳۶ء کی تاریخی ہڑتال کے بعد تسلیم کیا گیا، اور ایک عرصہ کی گفت و شنید کے بعد ۹ ستمبر ۳۶ء کو طرفین میں اتفاق ہو گیا، اور وعدہ کیا گیا کہ تین سال کے عرصہ میں انتداب ختم ہو جائیگا، معاہدہ کی تصدیق پارلیمنٹ میں ہو جائے گی، اور تقسیم شدہ اضلاع پھر اصل شام کے حدود میں شامل کر دیئے گئے،

یہ جولائی ۳۷ء کی باتیں تھیں، اب تازہ اطلاعات یہ ہیں، کہ فرانس اپنے وعدہ[2] سے پھر رہا ہے، اور شام ایک بار پھر انقلاب سے دوچار ہونے کو ہے، اللہ ان کی مدد کرے، ایک بات یہ بھی کہ اس معاہدہ کی دفعات مرتب ہوتے ہی (ستمبر ۳۶ء) ترکی نے سنجق کا مطالبہ شروع کر دیا اور فرانس نے (حلوائی کی دوکان، باپ دادا کا فاتحہ) کے اصول پر عربوں کے احتجاج کے باوجود ترکی کے اکثر مطالبات منظور کر لئے، آج سنجق میں بھی تفرنج اور مغربیت کا دور دورہ ہے، جس کا شکوہ ہمیں ترکی مین تھا، اب اس علاقہ کا نام بدل کر (ہاتائی) رکھا گیا ہے، اور......

فرنچ شمالی افریقہ (ص ۲۹۷-۳۰۷)

تونس میں فرانس کا باضابطہ اقتدار ۱۸۸۱ء میں قائم ہوا، یوں تو مالی حالت کی خرابی کی وجہ سے یہاں غیر ملکی اثرات پہلے ہی پیدا ہو چکے تھے، الجزائر پر فرانس کا حملہ ۱۸۳۰ء میں شروع ہوا، امیر عبدالقادر جزائری نے ایسا بہادرانہ مقابلہ کیا، کہ فرانس کے دانت کھٹے ہو گئے، لیکن...... سعدی از دست

[2] ۲۴ جنوری کے "اسٹیٹسمین" میں ایک واقف کار نامہ نگار (جو یقینی انگریز ہے) نے بھی یہ خیال ظاہر کیا ہے، کہ فرانس شام سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں، لیکن اس نے آخر میں یہ تجویز پیش کی ہے، کہ فلسطین، شرق اردن اور شام (موجودہ سوریہ) کو ملا کر ایک جمہوریت بنائی جائے، تاکہ یہود کو ایک وسیع میدان ملنے کی صورت میں "ارض اسرائیل" کا تخیل ترک کرنے پر آمادہ کیا جا سکے،

(اسٹیٹسمین، ۲۴ جنوری ۳۹ء ص ۱ کالم ۶)

خوشیتن فریاد برادران یوسف خود حریف کے ہوا خواہ بن گئے، آخر ۱۸۴۷ء میں امیر القادر نے ہتھیار رکھدیے، ان کی اولاد آج تک دمشق میں مقیم ہے، امیر عبدالقادر[1] اپنے کارناموں کے لحاظ سے ہندوستان کے سلطان ٹیپو سے مشابہت رکھتے ہیں، عربی ممالک میں سنوسی اعظم اور امیر محمد بن عبدالکریم ریفی کے سوا کوئی ان کے مقابلہ میں پیش نہیں کیا جاسکتا، (ان کے مجاہدانہ کارناموں کی تفصیل امیر شکیب ارسلان نے اچھی طرح کی ہے، ملاحظہ ہو حاضر العالم الاسلامی، جلد ۲ ص ۱۶۶ - ص ۱۶۷)

مراکش میں فرانسیسی اقتدار ۱۹۰۴ء میں قائم ہوا، فرانس نے مصر سے ہاتھ دھویا، اور اس کے عوض انگریزوں نے مراکش سے، اس طرح پر ۱۹۰۴ء سے دونوں آزاد ہوگئے، ایک خفیہ معاہدہ کی رو سے مراکش کو فرنچ اور اسپینی منطقوں میں تقسیم کرلیا گیا تھا، جرمنی کو بھی کچھ دنوں شمالی افریقہ کے اس حصہ کی ہوس رہی، پھر برطانیہ نے فرانس کی مدد کی، ۱۹۱۲ء میں مولای عبدالحفیظ سلطان مراکش نے فرانسیسی حمایت قبول کرلی لیکن عہدنامہ پر دستخط کرنیکے بعد اتنے کبیدہ خاطر ہوئے کہ تخت سے الگ ہوگئے، (بیچارے کا انتقال ابھی پیرس میں ہوا ہے، اپریل ۱۹۳۷ء) اسپینی منطقہ کے عربوں نے "حمایت" نہیں قبول کی، اور ۱۹۱۹ء سے باضابطہ چھیڑ چھاڑ شروع ہوگئی، ۱۹۲۱ء سے امیر عبدالکریم[2] نے کمان اپنے ہاتھ میں لی، اور اسپینیوں کو مسلسل شکستیں دیں، ۱۹۲۳ء میں اسپین کی فوجی

[1] امیر عبدالقادر کی بلند ہمت اور علو نفس کا اندازہ مندرجہ ذیل اشعار سے کیا جاسکتا ہے جو انکی تراوش فکر کا نتیجہ ہیں:

تسائلنی ام البنین و انها — لاعلم من تحت السماء باحوالی

(مجھ سے بچوں کی ماں حال پوچھتی ہے، حالانکہ وہ آسمان کے نیچے سب سے زیادہ میرے حالات سے واقف ہے)

الا فاسألی جنس الفرنسیس، تعلمی — بأن منایاهم بسیفی و عسالی،

(پوچھنا ہو تو فرانسیسیوں کی قوم سے میرا حال پوچھو (ان سے) معلوم ہوگا، کہ ان کی قضا میری تلوار اور نیزہ (کے ہاتھ) لکھی ہوئی ہے)

حکومت ریفی حدود سے ہٹ گئی، ۱۹۲۵ء میں امیر عبدالکریم[1] نے فرانسیسی علاقہ پر تاخت کی، پھر کیا تھا، دو بڑی حکومتیں ایک ضلع کی مہم سر کرنے کے لئے متحد ہوگئیں، اور دو لاکھ مسلح فوج چند ہزار عربوں کے مقابلہ میں صف آرا کی گئی، آخر عبدالکریم عاجز آگئے، اور ۲۰ مئی ۱۹۲۶ء کو انہیں مداغاسکر بھیج دیا گیا، جہاں وہ اب تک جلاوطن ہیں، مراکش کے اسپینی منطقہ میں فرنکو کی مہم سے ایک نئی صورت حال پیدا ہوگئی ہے، پچاس ہزار عرب سر بکف میدان میں ہیں اور مستقبل کے مبہم وعدوں پر جان دے رہے ہیں اگر وہ خود مختار ہوتے، تو کسی کا ساتھ نہ دیتے لیکن بیچارے مجبور ہیں، فرنکو کی فوج میں کٹ رہے ہیں، اگر کامیابی بھی ہوئی، تو وعدوں کا ایفا مشکوک ہے، ادھر فرانس فرنکو کے وعدوں سے برہم ہے، اسپینی منطقہ کو اگر اختیارات ملے، تو مراکش کے فرانسیسی منطقہ میں اس کا ردعمل ہونا ناگزیر ہے

مراکش میں فرانس کا دور حکومت بالکل تاریک ہے، اہل ملک کو کوئی حق حاصل نہیں، مذہبی تعلیم میں رکاوٹیں ہیں، ۱۹۳۰ء میں ایک فرمان (جسے مراکش کی اصطلاح میں "ظہیر" کہتے ہیں)

(بقیہ حاشیہ ص ۴۴) ومن عادة السادات بالجیش تحتمی — وبی یحتمی جیشی وتمنع ابطالی،

افسروں کا خاصہ ہے، کہ وہ لشکر کی آڑ میں پناہ لیتے ہیں، لیکن میری فوج میری آڑ میں پناہ لیتی ہے

اور میرے افسران میرے سہارے مدافعت کرتے ہیں،

امیر کثیر الاولاد تھے، ایک صاحبزادے امیر سلیم جزائری کو (جو عثمانی فوج میں ممتاز افسر تھے) جمال سفاح نے دوران جنگ میں پھانسی دیدی، دوسرے صاحبزادے امیر خالد عرصہ تک الجزائر میں قومی تحریک کی قیادت کرتے رہے، وفات کو دو چار برس سے زیادہ عرصہ نہیں گذرا ان کے پوتے امیر سعید جزائری آج کل دمشق میں ممتاز حیثیت کے مالک ہیں،

[1] اصلی نام محمد بن عبدالکریم ہے، مصنف نے عبدالکریم لکھا ہے، اور یہی زبان زد ہے، انکے کارناموں کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، (حاضر العالم الاسلامی جلد ۳ ص ۱۶۳، ص ۲۰۷)

جاری ہوا جس کی رو سے بربر آبادی کو عربوں سے الگ کرنے کی کوشش جاری ہے، تمام عالم اسلام میں اس پر احتجاج ہوا، لیکن شنوائی نہ ہوئی، کیتھولک مشنریوں کو سرکاری امداد ملتی ہے، اخبارات کی زبان بندی پر سختی کے ساتھ عمل درآمد ہو بالآخر تنگ آکر مراکشیوں نے پیرس سے ایک فرنچ رسالہ (مغرب) جاری کیا ہے،

الجزائر کا حال بھی ابتر ہے، مسلسل احتجاج کے باوجود اب تک کچھ نہیں ملا، مقبوضات کے معاملہ میں اشتراکی اور قدامت پسند سب یکجا ہو جاتے ہیں، الجزائری بھی پیرس سے "الامۃ" (El Ouma) نامی ایک فرنچ اخبار نکالتے ہیں، الجزائر کی جمعیۃ العلماء (جس کے صدر عبد الحمید بن بادیس ہیں) اور اس کے آرگن "الشہاب"[1] (ماہانہ) اور البصائر (ہفتہ وار) مفید خدمات انجام دے رہے ہیں،

خلاصہ یہ کہ سارے شمالی افریقہ میں ایک تحریک پائی جاتی ہے، جو ایک طرف فرنچ اقتدار کی مخالفت اور دوسری جانب وحدت عربیہ کی حمایت کرتی ہے،

فرانس آسانی سے اپنے مقبوضات سے دستبردار ہونے کے لئے تیار نہیں، جنگ عظیم میں ان علاقوں سے خوب مدد لی، صرف الجزائر سے ایک لاکھ تہتر ہزار جنگجو سپاہی اور ایک لاکھ انیس ہزار عام مزدور دیئے گئے تھے، لیکن اب لیل ونہار بدل چکے ہیں، آزادی کی لہر دوڑ چکی ہے،

[1] راقم الحروف کے پاس یہ دونوں پرچے، (الضیاء) کے مبادلہ میں آتے تھے، یہ کسی حال میں ہندوستان کے اچھے اخبارات اور رسالوں سے پیچھے نہیں ہیں، "الشہاب" کا ماہانہ سیاسی تبصرہ کسی حال میں "جامعہ" سے برا نہیں ہوتا، ان کا ہفتہ وار حکومت کی سخت گیری کے باعث کئی لباس بدل چکا ہے، پہلے (السنۃ) تھا، پھر (الشریعۃ) اس کے بعد (الصراط) کے قالب میں نمودار ہوا، آخری لباس البصائر تھا، اللہ جانے سال ڈیڑھ سال میں کیا ہو گیا ہو،

جو کسی کے تھامے نہیں تھمتی،

اس سلسلہ میں ایک بات اور قابل لحاظ ہے، مصر و شام کے برخلاف شمالی افریقہ کے عربوں میں افرنگی وطنیت یا دہریت کا نام و نشان نہیں، ان کی تحریک خالص اسلامی ہے، عربیت بھی ہے لیکن اسلامیت کے ماتحت موجودہ حالات میں یہ چیز بہت کچھ قابل مسرت ہے، تونس نے اسکی اچھی مثال پیش کی ہے، وہاں حکومت نے ۲۰ دسمبر ۱۹۲۳ء کو ایک قانون نافذ کیا جس کی رو سے اہل ملک کو فرانسیسی قومیت (الجنسیۃ الفرنسیۃ) اختیار کر کے تمام شہری حقوق حاصل کرنے کا اختیار دیا گیا، لیکن قوم پروروں نے اس قانون کا مقاطعہ کیا، اور پوری قوم نے فرانسیسی قومیت اختیار کرنے والوں کا اجتماعی بائیکاٹ کیا، ان کی نماز جنازہ نہیں پڑھی جاتی، انھیں مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہیں کیا جاتا، بعض اوقات حکومت نے اپنے ہوا خواہوں کی تدفین مشین گن کے زیر سایہ کرادی لیکن دوسرے روز لاش بے گور وکفن قبر سے باہر تھی، ...... اس طرح کی رسہ کشی بارہا ہوئی، آخر رائے عامہ کی فتح ہوئی، یہ کوئی نئی بات نہیں، الفتح اور دیگر عربی اخبارات میں اس قسم کی مثالیں بارہا شائع ہو چکی ہیں،

(اطالیہ اور اسلام (ص ۳۰۷-۳۱۸)

عہد حاضر میں مسلمانوں کے ساتھ اٹلی کا پہلا رشتہ طرابلس الغرب پر حملہ سے شروع ہوا، عثمانی حکومت نے طرابلس کو اٹلی کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا، انور مرحوم کی ذاتی تگ ودو سے بحث نہیں، میرا الزام حکومت پر ہے، سنوسیوں[1] نے اٹلی کا پورا مقابلہ کیا، سنوسی اعظم (سید احمد شریف سنوسی متوفی ۱۳۵۲ھ) اور ان کے ساتھیوں نے اطالوی دیو کا بیس سال تک پامردی سے مقابلہ

[1] سنوسی زاویہ کی تاسیس محمد بن علی السنوسی (متوفی ۱۸۳۵ء) نے کی، آخری سنوسی زعیم جنھیں امیر شکیب السنوسی الکبیر لکھتے ہیں) ان کے پوتے تھے،

کیا، اس جہاد کا آخری سرگروہ غازی عمر مختارؒ (جن کی عمر ستر سال سے متجاوز تھی) ۱۹۳۱ء میں سولی کے تختہ پر چڑھا دیا گیا،

۱۹۲۲ء سے اطالیہ نے طرابلس اور صحرائے لیبیا کے اندرونی سنوسی زاویوں پر قبضہ کی کوشش کی، آخر جغبوب پر بھی قبضہ ہوگیا، اور اس قبضہ کے بقا و استحکام کی خاطر اٹلی نے حکومتِ مصر سے ۱۹۲۵ء میں معاہدہ کیا، مصر نے اٹلی کا قبضہ تسلیم کرلیا، شاید یہ اسی دوستی کا نتیجہ تھا، کہ سنوسی اعظمؒ کو اپنے آخری ایامِ حیات میں علاج کے لئے بھی مصر آنے کی اجازت نہ ملی، اور تو اور ازہر کی سرکار نے غائبانہ نماز جنازہ کی بھی اجازت نہیں دی، مشرقی افریقہ میں اٹلی کے دو علاقے اریتیریا اور سمالی لینڈ ہیں، لیکن ان دونوں میں سے کوئی اطالوی مالِ تجارت کا بازار نہ بن سکا، ان کی ساری اہمیت حبشہ کی قربت کے باعث تھی، ۱۹۰۶ء کے "ثلاثی" (سہ گانہ) معاہدہ کے مطابق حبشہ میں برطانیہ فرانس اور اٹلی کے مخصوص منطقہائے نفوذ تسلیم کرلئے گئے تھے، ۱۹۲۶ء میں برطانیہ اور اطالیہ کے درمیان ایک دوسرا معاہدہ ہوا، جس کے خلاف حبشہ نے مجلسِ اقوام میں احتجاج بھی کیا،

ایک متعین پالیسی کے ماتحت اٹلی نے ۱۹۳۵ء میں حبشہ پر دھاوا بول دیا، اور مئی ۱۹۳۶ء میں یہ مہم سر بھی ہوگئی، مسلمانوں نے بھی احتجاج کیا، یہ احتجاج زیادہ تر حبشہ اور عہدِ نبوی کے دوستانہ مراسم کے زیرِ اثر تھا، شاید کم لوگوں کو یہ معلوم ہوگا، کہ حبشہ میں مسلمانوں کی آبادی غیر مسلموں سے زیادہ ہے، اور ان کے ساتھ سابق نجاشی کا سلوک نہایت ظالمانہ تھا، مصنف نے اس طرف اشارہ کیا ہے، تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، (حاضر العالم الاسلامی جلد ۳ ص ۱۰۸-۱۱۹) اور الفتح نمبر ۳ ۵۴ میں ایک "واقف کار مصری مسلمان" کا مضمون قابلِ مطالعہ ہے، اسی طرح امیر البیانؒ کا مفصل مضمون مندرجہ الفتح نمبر ۴۴۴، اس مسئلہ پر نہایت شافی روشنی ڈالتا ہے،

یہ ایک حقیقت ہے، کہ حبشہ کے بعض علاقوں میں مسلمانوں نے اطالیہ کا خندہ پیشانی سے استقبال کیا، مصنف مسولینی کے میٹھے میٹھے بیانات سے مطمئن معلوم ہوتے ہیں، لیکن طرابلس الغرب میں آج جو کچھ ہو رہا ہے، قابلِ فراموش نہیں، لوگ فلسطین کو رو رہے ہیں، یہاں ایک عربی علاقہ مستقل طور پر اسلام کی آغوش سے الگ کیا جا رہا ہے، طرابلس کا نام ختم ہوگیا، اب وہ مملکت رومہ کا ایک جزء ہے، طرابلس کے رہنے والے عرب اب طرابلسی نہیں رہے، بلکہ رومی یا طلیانی ہوگئے، آج کل عربی اخبارات میں (امۃ مسلمۃ تُساق الی الفناء) ایک مسلمان قوم فنا کی کے گھاٹ اتاری جارہی ہے"، کی صدا بلند ہے، لیکن کمزوروں کی کون سنتا ہے، ملاحظہ ہو (الفتح شوال و ذی قعدہ ۱۳۵۷ھ نمبر ۶۳۰-۶۳۲،

یمن کے ساتھ بھی اطالیہ کا تعلق ہے، گو اب تک یمن آزاد تسلیم کیا جاتا ہے، لیکن اٹلی کے تجارتی امتیازات کافی حد تک خطرناک ہیں، عربی اخبارات امام یحییٰ کو فوجی استحکام کی طرف برابر توجہ دلاتے ہیں، لیکن وہاں اب تک سو سال پہلے کی دنیا ہے، وہ تو برطانیہ اور اطالیہ کی باہمی چشمک کو دعا دیجئے، کہ اب تک یمن کی موجودہ حیثیت قائم رکھنے (Status quo) پر دونوں متفق ہیں،

مسلمانوں کی ایک دوسری آبادی البانیہ کے ساتھ بھی اطالیہ کا گہرا تعلق ہے، البانیہ کا بادشاہ احمد زوغو ہے[1]، وہاں کی دو تہائی آبادی مسلمان ہے، اسلئے طبعی طور پر البانیہ میں اطالوی اقتدار مسلمان اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے،

عراق کی نئی حکومت (ص ۳۱۹-۳۲۳)

عراق پر برطانیہ کی نگاہ عرصہ سے تھی، خلیج فارس سو برس سے انگریزوں کے قبضہ میں ہے،

[1] معارف:- یہ مضمون البانیہ پر اٹلی کے قبضہ سے پہلے لکھا گیا تھا، اب یہ حکومت بھی مسولینی کے جوع الارض کا شکار ہوگئی،

دوران جنگ میں برطانیہ نے عراق پر بھی اپنا جھنڈا لہرا دیا،

جنگ کے بعد شام قوم پرست عربوں کی امیدوں کا مرکز تھا، فرانس کے قبضہ کے بعد یہ امیدیں عراق کی طرف منتقل ہو گئیں، برطانیہ کو عراق کی حکم برداری (انتداب) ۱۹۲۰ء میں ملی، لیکن ایک طرف تو اہل عراق انگریزی استیلاء کے خلاف مسلسل احتجاج کرتے رہے، دوسری طرف تیل کے چشموں کے باعث برطانیہ کسی نتیجہ پر نہیں پہونچ رہا تھا، اس لئے ۱۹۲۴ء تک ملک کی سیاسی حالت متزلزل رہی، ۱۹۲۰ء میں عظیم الشان مسلح بغاوت[1] نمودار ہوئی، سر پرسی کاکس کے ذمہ یہ مہم کی گئی، آخر ایک عرب وزارت بنی، امیر فیصل منصب حکومت پر متمکن ہوئے، معاہدہ کا پہلا مسودہ عربوں کے لئے ناقابل قبول تھا، بڑی دشواریوں اور خونیں معرکوں کے بعد ۱۹۲۴ء میں عراق کی نئی حکومت نے یہ معاہدہ منظور کیا، ۱۹۲۶ء میں مجلس اقوام کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ کے بموجب موصل عراق کو مل گیا، اور انقرہ کے "ثلاثی" (عراق، برطانیہ، ترکی) معاہدہ (۱۹۲۶ء) کو بین الاقوامی منظوری حاصل ہو گئی، نیز ایک نیا عراقی برطانوی معاہدہ جنوری ۱۹۲۶ء میں مرتب ہوا، ۱۹۲۷ء میں معاہدہ پر پھر نظر ثانی ہوئی، اور برطانیہ نے پہلی بار عراق کی خود مختاری تسلیم کی جس کی تکمیل ۱۹۳۲ء سے پہلے نہ ہو سکی، مالی اور فوجی معاہدوں کے لئے مجلس اقوام کی توثیق شرط قرار دی گئی تھی، اس سے دشواریاں پیدا ہو گئیں، ملک میں ہیجان کے وجہ سے ۱۹۳۰ء میں ایک نیا معاہدہ مرتب ہوا، اور عراق کی نمائندہ پارلیمنٹ نے اس پر مہر تصدیق ثبت کی، عراق کی آزادی تسلیم کی گئی، برطانیہ نے اپنے لئے دو اہم تحفظات رکھے، :-

[1] لفظ (بغاوت) سے غلط فہمی نہ ہو، کمزوروں کی ہر تحریک ارباب اقتدار کے نزدیک "بغاوت" ہی کہلائیگی، لیکن مظلوم اسے جہاد کہیں گے، راقم الحروف کے ذہن میں عربی کلمہ (ثورۃ) ہے، جو حق و باطل دونوں قسم کی شورش کیلئے استعمال ہو سکتا ہے، افسوس کہ عاجز کے محدود علم میں اس کا اردو مرادف نہیں ملتا،

۱- فوجی نقل و حرکت کے لئے حدود عراق کے استعمال کا اختیار،

۲- فرات کے مغربی حصہ میں ہوائی مستقر برقرار رکھنے کا حق،

۳ را کتوبر ۱۹۳۲ء کو عراق مجلس اقوام کی رکنیت سے سرفراز ہوا، اس موقع پر امیر ملکہ شاہ فیصل کے متعلق چند کلمات لکھنا نامناسب نہ ہوگا، عراق کی یہ ساری کامیابی عراقیوں کی بہادری کے بعد شاہ فیصل کی سیاسی بیدار مغزی کا نتیجہ ہے، شریف حسین کے بیٹوں میں یہ خاص امتیاز کے مالک تھے، اگر جمال پاشا سفاح کی سفاکیاں عمل میں نہ آتیں، تو یہ دوران جنگ میں ترکوں کے خلاف ہرگز نہ جاتے، (ملاحظہ ہو، امیر شکیب ارسلان کا مضمون "الجامعۃ الاسلامیہ" فلسطین، ۲۰ جمادی الثانیہ ۱۳۵۲ھ، اور رسالہ الضیاء شعبان ۱۳۵۲ھ) افسوس کہ اس معاہدہ کی تکمیل کے بعد زیادہ دنوں تک امیر فیصل زندہ نہ رہے، ورنہ عراق آج کچھ اور ہوتا، مرحوم نے ۸ ستمبر ۱۹۳۳ء کو سوئٹزرلینڈ میں جان جان آفرین کے سپرد کی، ان کے جوان سال بیٹے شاہ غازی ان[1] کے جانشین قرار پائے،

عراق ایک زرخیز ملک ہے، زراعت پر زندگی کا مدار ہے، اب صنعت پر بھی زور دیا جا رہا ہے، تیل کے چشموں سے ۸ لاکھ پونڈ کی سالانہ آمدنی اس پر مستزاد ہے، اندرونی سیاسی حالات ایک رفتار سے چل رہے تھے، کہ جنرل بکر صدقی (جس نے اشوریوں کی سرکوبی میں نمایاں خدمت انجام دی تھی) نے جعفر[2] عسکری کو قتل کر کے یٰسین ہاشمی مرحوم کی وزارت ختم کر دی اور ستمبر ۱۹۳۶ء

[1] معارف :- افسوس ہے کہ گذشتہ اپریل کو موٹر کے ایک اتفاقی حادثہ میں یہ جوان سال بادشاہ بھی چل بسا، اور اب اس کا صغیر السن بچہ اپنے چچیرے دادا امیر عبد اللہ والی شرق اردن کی ولایت میں تخت نشین ہوا ہے۔

[2] جعفر عسکری عربی تحریک کے ایک سرگرم قائد اور امیر فیصل کے ساتھ کام کر چکے تھے، پہلے یہ عثمانی فوج میں افسر تھے، سنوسیوں اور انگریزوں کی جنگ میں یہ گرفتار ہوئے، پھر دنیا میں یہ برطانیہ کے دوست کی حیثیت سے مشہور ہوئے، امیر شکیب کے یہ الفاظ قابل غور ہیں :-

میں قلمدان وزارت سلیمان حکمت کو تفویض ہوا،

یٰسین ہاشمی عربی تحریک (وحدت عربیہ یا "پان عرب") کے پرانے کارکن اور شاہ فیصل کے دست راست تھے، اس وقت تک عراق وحدت عربیہ کی راہ پر جارہا تھا، سلیمان حکمت کی وزارت کمالیون کی طرف مائل تھی، سلیمان کے بڑے بھائی محمود شوکت پاشا عثمانی حکومت مین صدر اعظم رہ چکے تھے، بکر صدقی بھی کُردی تھا، اسے بھی عربوں کی تمناؤن اور آرزوؤں سے دلچسپی نہیں ہوسکتی تھی، اسلئے عام پبلک اس وزارت سے خوش نہیں تھی، اس پر طرہ یہ تھا کہ سابق وزرا کو جلاوطن کردیا گیا، یہی نہیں، بلکہ یٰسین پاشا ہاشمی (جن کا انتقال کچھ ہی عرصہ بعد دمشق میں ہوا) کی لاش بھی بغداد میں سپرد خاک نہ کی جاسکی، اسکے لئے ایسی شرطیں عائد کی گئیں، کہ ماننے والوں کے اعزہ نے دمشق ہی کو ترجیح دی، ان وجوہ کے ماتحت بکر صدقی کا قتل (۱۱ر اگست ۳۷ئ) ہمارے لئے کوئی غیر متوقع خبر نہیں تھی،

جمیل مدفعی کو جو وحدت عربیہ کی مہم پر پھر کا قصد کر رہے تھے، بلاکر سلیمان حکمت کے بجائے وزارت عظمٰی تفویض ہوئی سال ڈیڑھ سال یہ وزارت چلی، اب شاہ فیصل کے دیرینہ رفیق قصر شاہی کے معتمد، اور شاید برطانیہ کے چہیتے نوری سعید (ہاشمی وزارت کے وزیر خارجہ) اس منصب سے سرفراز کئے گئے ہیں، اگر فلسطین اور وحدتِ عربیہ کے متعلق ان کا طرز عمل حوصلوں کے مطابق ہوا تو ممکن ہے یہ وزارت ہردلعزیزی حاصل کرے،

مصنف نے صرف سلیمان حکمت کی "کمالی ذہنیت" کا ذکر کیا ہے، گذشتہ سطروں میں شاہ فیصل

(بقیہ حاشیہ ص ۵۱)

جعفر باشا العسکری رئیس وزراء بغداد بالأمس ومن اعضاء الوزراء الیوم، وھو من اعز احباء الانکلیز" (حاضر العالم الاسلامی جلد ۲ ص ۱۴۰ و نیز ملاحظہ ہو (جلد ۴) ص ۳۹۶)

اور آخری وزارتوں کے متعلق جو کچھ لکھا گیا، وہ راقم الحروف کے ذاتی مطالعہ اور استنتاج پر مبنی ہے، مصنف صرف واقعات فراہم کرتے ہیں، "غیر جانبداری" پر ان کا پورا پورا عمل ہے،

عراق کی جوان سال حکومت کے بارے میں ایک بات اور قابل ذکر ہے، فلسطین کے بارے میں اس کا رویہ حد درجہ قابلِ ستائش اور جرأت آموز ہے، اور اس باب میں تمام وزارتون کا رویہ ہمدردانہ رہا، فوزی قاوقجی کا بغداد میں شاہانہ استقبال ہوا، شاہ غازی نے دیوان شاہی میں دعوت دی، اسٹیٹسمین، اور لندن ٹائمز نے بار بار برطانیہ کو عراق کے خلاف اشتعال دلانے کی کوشش کی، اس سلسلہ میں توفیق سویدی، سابق وزیر خارجہ، اور حال وزیر داخلہ کی کامیاب کوششیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں، اب نوری سعید کی برطانیہ نوازی سے ذرا شبہہ ہوتا ہے، بہرحال ابھی کوئی رائے قائم نہیں ہوسکتی، آج کل میں بلکہ اس تحریر کے چھپنے سے پہلے حال کھل جائیگا،

(یہ سطریں ۲ ذی الحجہ ۵۷ھ م ۲۴ جنوری ۱۹۳۹ئ کو لکھی گئی ہیں،)

شرق اُردن (۳۲۴)

شرق اُردن پر امیر عبداللہ حکمرانی کرتے ہیں، "وفاداری بشرط استواری" پر ان کا عمل ہے، کرنل لارنس کی رائے میں عبداللہ جنگ کی بجائے امن وسکون کی فضا میں زیادہ مفید ہوسکتے ہیں یہود کی نگاہ آز بھی اس علاقہ پر برابر پڑتی رہی، خلاصہ یہ کہ آج تک امیر عبداللہ کا شاید ہی کوئی فعل مسلمانون اور عربون کے لئے مفید ہوا ہو، انگریزوں کی نگاہ میں ان کی کیا وقعت ہے، اس کا ایک ہلکا سا اندازہ اسٹیٹسمین (۲۵ جنوری ۳۹ئ) کے ایڈیٹوریل نوٹ سے ہوسکتا ہے،

جزیرۃ العرب کی نئی زندگی (ص ۳۲۴-۳۳۴)

آج سے تیس برس پہلے عرب میں تین خاندان حکمران تھے، حجاز میں شریف، نجد اور اسکے نواحی میں آل رشید، باقی ماندہ علاقہ میں آل صباح، اس فہرست میں اگر امام یمن اور عسیر کے امرا دریسی

کو بھی شامل کر لیجئے، تو پانچ حاکم ہو جاتے ہیں،

ابن سعود کے زیرِ سایہ ایک متحدہ حکومت قائم ہوئی، اس وقت سعودی حکومت کا رقبہ فرانس، جرمنی، بلجیم و سوئٹزرلینڈ کے متحدہ رقبہ سے بھی زیادہ ہے، جنگ سے پیشتر اس نے احسا پر قبضہ کیا، پھر آلِ رشید کو زک دی، ۱۹۲۴ء میں شریف حسین کا قلع قمع کیا، اور ۱۹۲۵ء میں حجاز مکمل طور پر ابن سعود کے زیرِ نگیں ہو گیا، ۱۹۳۰ء میں عسیر بھی حدودِ مملکت میں شامل کر لیا گیا، ۱۹۳۴ء میں امام یمن کی فوج شکست کھا چکی تھی اور بحرِ احمر کے مشرقی ساحل پر اس کا قبضہ ہوا چاہتا تھا، کہ رہنمایانِ عالمِ اسلام (سید امین حسینی، امیر شکیب، ہاشم اتاسی، محمد علی علوبہ) کی مداخلت سے معاہدۂ طائف کی تکمیل ہوئی، (جون ۱۹۳۴ء)

مصنف نے شریف حسین کے دورِ حکومت کی خرابیاں، اور سلطان ابنِ سعود کی خوبیاں تفصیل سے گنائی ہیں، اہلِ ہند حجاز اور والیِ حجاز سے اچھی طرح واقف ہیں، اس لئے کسی اقتباس یا تحشیہ کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی،

مصنف نے سعودی حکومت کی ستائش میں، جو کچھ لکھا ہے، اس سے ہمیں اتفاق ہے، صرف ایک بات کھٹکتی ہے، جی چاہتا ہے، کہ وہ اہلِ علم کے گوش گذار کر دیجائے، میری مراد سعودی حکومت کی خارجی حکمت عملی سے ہے، اینگلو امریکن کمپنی سے معدنیات کے استخراج کا معاہدہ، کلیفورنیا کی اسٹینڈرڈ آئل کمپنی کو تیل کے چشموں کا ٹھیکہ، عراق پٹرولیم کمپنی کو بحرِ احمر کے ساحلوں پر تیل کی تلاش کی اجازت، ان سب کی تاویل و توجیہ سمجھ میں آتی ہے، یا آسکتی ہے، مسٹر فلبی (جنھیں شاید بعض نیک دل مسلمان الحاج عبد اللہ فلبی سمجھتے ہوں) کا تقرب بھی گوارا کیا جا سکتا ہے، لیکن ایک مسئلہ ایسا بھی ہے جس کی تاویل نہیں سمجھ میں آتی، فلسطین کے سلسلہ میں تین سال سے تمام عربی علاقے پریشان ہیں، اخبارات، انجمنیں، وزارتیں، سب کے سامنے ایک مسئلہ ہے، یمن، عراق اور مصر کی حکومتوں نے اس باب میں دخل اندازی کی، اور قوت کے ساتھ، یمن کے سرکاری اخبار "الایمان" تک نے سخت مضامین لکھے،

اس کے برخلاف "ام القریٰ" میں اسپین، چین، زیکو سلو واکیا، دنیا بھر کی خبریں آتی ہیں، لیکن غریب فلسطین کا کہیں نام بھی نہیں آتا، "الشباب" (مصر) نے بار بار نکتہ چینی کی، آخر تنگ آکر محمد علی الطاہر نے مبادلہ بند کر دیا، مگر سعودی حکومت کا آرگن اپنے حال پر قائم ہے، اس سے بڑھکر یہ کہ قاہرہ میں پارلیمنٹری کانفرنس ہوئی، (اکتوبر ۱۹۳۸ء) چین، مراکش اور یوگوسلاویا تک سے نمایندے آئے، ہمسایہ حکومتوں کے مندوبین تھے، یمن سے حکومت اور قوم دونوں کے نمایندے آئے، لیکن سعودی حکومت اور حجاز کی نمایندگی نہیں ہوئی، دنیا کے مسلمان انگشت بدندان تھے، کہ یہ کیا معاملہ ہے؟ موتمر کے اختتام پر ڈاکٹر عبد الحمید سعید نے تار کے ذریعہ فیصلوں کی تائید چاہی، جواب ملا، (یھمنا ما یھم المسلمین) مسلمانوں کا درد دکھ ہمارا درد دکھ ہے" کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟ یہ اندازِ بیان تو نجد کے وہابی فرمانروا کا نہیں معلوم ہوتا،

"الفتح" کے ایڈیٹر محب الدین خطیب، سلطان ابن سعود کی اس پالیسی کی صفائی پیش کرنا چاہتے ہیں، (ملاحظہ ہو: نمبر ۶۳۶، ۲۱ ذی القعدہ) ٹرزولٹ کے نام سلطان کا ایک مکتوب بھی شائع ہوا ہے، یہ سب صحیح، لیکن ام القریٰ فلسطین کا نام زبان پر لانے سے کیوں لرزہ براندام ہے؟

ایران [1] ص ۴۴ ۳۳ و ۴۴۲

(رضا شاہ پہلوی کے دورِ حکومت میں)

پندرہ سال پیشتر اور آج کے ایران میں بڑا فرق ہے، آج ایران بالکل بدلا ہوا ہے، آج ایران آزاد اور اپنی قسمت کا آپ مالک ہے، جدید ایران کا ستارہ ۱۹۲۲ء میں چمکا، اور ۱۹۲۴ء میں ایرانی

---

[1] ایران کے ضمن میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ حرف بحرف مصنف کی تحریر کا خلاصہ ہے، راقم الحروف کی معلومات اس باب میں بہت محدود ہیں،

تخت پر متمکن کر دیا، سنہ ۲۲ء سے سنہ ۲۶ء تک شاہ کی کوششیں فوج کی تنظیم اور مرکز کی حیثیت بڑھانے میں صرف ہوئیں،

مئی سنہ ۲۸ء میں بیرونی امتیازات ختم کر دیئے گئے، ایران میں عام طور پر ترکی کی روح کام کر رہی ہے، اور اسی نمونہ پر نئی حکومت کی بنیادیں مستحکم کیجارہی ہیں،

اب مرکز کا وقار قائم ہو چکا ہے، سنہ ۲۵ء میں جبری فوجی تعلیم کا نفاذ ہوا، اور آج ملک میں ڈھائی لاکھ باضابطہ مسلح سپاہ موجود ہے، مدنی قوانین میں بھی تبدیلیاں ہوئی ہیں، تعلیمی ترقی نمایاں ہے، تقریباً ہزار طالب علم یورپ اور امریکہ میں زیر تعلیم رہا کرتے ہیں، صنعت و حرفت پر خاص زور دیا جاتا ہے، افسوس یہ ہے کہ اب تک بعض اہم تجارتین غیر ملکیون کے قبضہ مین ہیں، شکر کی تجارت البتہ حکومت کے ہاتھ میں ہے، ایک وسیع ریلوے لائن زیر تعمیر ہے، جو پورے ملک کو دو حصوں میں تقسیم کر دے گی، بڑی بات یہ ہے کہ اس اہم اور وسیع اسکیم میں کسی غیر ملکی کمپنی کا ایک حبہ نہیں ہے، ایران کی مالی حالت قابل اطمینان ہے،

فنون لطیفہ اور آثار قدیمہ کی طرف بھی توجہ کیجاتی ہے، لندن کی رائل اکادمی میں ایرانی آرٹ کی نمائش (سنہ ۳۱ء) اور فردوسی کی ہزار سالہ برسی کی تقریب سے ایران کی ثقافتی حیثیت بلند ہوگئی ہے،

روس اور برطانیہ سے تعلقات برابری کے اور دوستانہ ہیں، یہ صورت خاص طور پر اینگلو پرشین آئل کمپنی کے جھگڑے کے بعد سے پیدا ہوئی ہے، اپریل سنہ ۳۳ء کے نئے ٹھیکہ کے بعد ایران کو سالانہ ساڑھے سات لاکھ پونڈ سے کم نہیں ملتا، اس کے علاوہ ایرانی طلبہ کو دس ہزار پونڈ سالانہ کے وظائف ملتے ہین، برطانیہ سے صرف بحرین کے ساحل کا جھگڑا رہ گیا ہے، ترکی سے حدود کا معاملہ سنہ ۲۹ء میں خاطر خواہ طے ہو گیا تھا، سنہ ۳۴ء میں خود شاہ نے ترکی کی سیاحت کی، افغانستان سے بھی تعلقات شگفتہ ہین، طہران کی اصلاحات سے کابل کا اثر پذیر ہونا طبعی بات ہے،

آج کا افغانستان (ص ۳۴۲ تا ۳۴۴)

فروری سنہ ۱۹ء مین امیر امان اللہ تاج و تخت کا وارث ہوا، امیر حبیب اللہ پر برطانیہ نواز ہونے کا شبہہ تھا، اس لئے قتل کر دیا گیا، مئی سنہ ۱۹ء میں افغان فوجیں حدود ہند کی طرف بڑھنے لگیں، انگریزی سپاہ سے جھپٹ ہوئی، آخر برطانیہ نے افغانستان کی خود مختاری تسلیم کی، اور سرحد کا مسئلہ بھی افغانستان کے حسب خواہ طے پا گیا، (معاہدہ راولپنڈی)

نیا بادشاہ کمال اتاترک اور رضا شاہ کے طرز کا "مصلح" تھا، اوس نے مغربی ملکوں کے نمونہ پر اصلاحات کی ایک مہم شروع کر دی، روس سے سنہ ۲۱ء میں ایک دوستانہ معاہدہ ہوا، لیکن افغان حکومت نے روسی یا برطانوی ماہرین فن سے ہمیشہ احتیاط کی، اس کی رائے میں دور دراز کے استاد اور انجینیر بے ضرر ہوتے ہیں، ہمسایوں سے ڈرنا بے جا نہیں تھا، مارچ سنہ ۲۱ء میں ترکی سے بھی دوستانہ معاہدہ ہوا، اسی سال ایران سے ایک تجارتی و سیاسی میثاق کی طرح ڈالی گئی،

سنہ ۲۷ء میں امان اللہ نے یورپ کا سفر کیا، راستہ میں مصر بھی ٹھہرا، ایران و ترکی کی راہ سے افغانستان کو واپسی ہوئی، اس نے مغربی طرز بود و ماند کی نقل اتارنی چاہی، اور قدیم روایات کو یکسر بدل دینے کی کوشش کی، نئی فوج اور نئے عہدہ دار تو اس نے تیار نہیں کئے اور جلد بازی میں پرانی سپاہ کو اپنا بدخواہ بنا لیا، اس کے علاوہ محاصل کی زیادتی اور فوجی بھرتی مین سختی کی شکایت بھی عام تھی، سنہ ۲۸ء میں شورش اٹھی، اور مئی سنہ ۲۹ء میں امان اللہ کو وطن چھوڑنا پڑا، آخر نادر شاہ نے آکر افراتفری دور کی، اور عام خواہش کے مطابق ۱۶ اکتوبر سنہ ۲۹ء کو مسند حکومت پر متمکن ہوئے،

نئے سلطان کے دور میں اندرونی اصلاح تیزی سے ہو رہی ہے، ایک فوجی اکادمی قائم ہے، یونیورسٹی کی تاسیس بھی ہوئی ہے، اسلامی ملکوں سے سیاسی مراسم استوار کئے گئے

نادر شاہ نے اسلامی روایات پر قائم رہتے ہوئے جدید اصلاحات کی اچھی چیزیں لے لیں،

افسوس کہ ترقی کی یہ رفتار چند روزہ ثابت ہوئی، شاہ غازی ۸ نومبر ۳۳ء کو شہید کر دیئے گئے، ان کے جانشین ظاہر شاہ کے دور سلطنت میں بھی وہی معتدل حکمت عملی چل رہی ہے، افغانستان مجلس اقوام کا ممبر بھی بن چکا ہے،

مرحوم و مغفور حضرت علامہ اقبال کے الفاظ میں افغان اپنے اندر تین نمایاں خصوصیات رکھتے ہیں:-

"مذہبی روح کا استحکام، خاندان، اور طبقات کے قیود سے کامل آزادی، اور وہ صحیح توازن جس کے ماتحت انھوں نے ہمیشہ مذہبی اور قومی تخیلات کی پرورش کی ہے، ماضی کو باقی رکھنے کی روح، افغانوں کے لئے ہمیشہ قوت کا سرچشمہ رہی ہے، اس کے ذریعہ وہ دور جدید کے مقتضیات کو لبیک کہتے ہوئے ماضی سے اپنا رشتہ قائم رکھتے ہیں"،

(منقول از دیباچہ کتاب افغانستان)

ہندوستان اور مشرق بعید میں اسلامی تجدد (ص ۳۵۴-۳۴)

جب کسی غیر ہندی اہل قلم کی کوئی تاریخی یا سیاسی کتاب (عربی ہو یا انگریزی) ہمیں ملتی ہے، تو ہم پہلے اس میں ہندوستان اور خاص کر مسلمانوں کا حال دیکھتے ہیں، اور اس کی صحت و صداقت کے اعتبار سے پوری کتاب کے متعلق رائے قائم کرتے ہیں ہمیں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں، کہ زیر نظر کتاب اس معیار پر پوری اتری، بعض بہت معمولی فروگذاشتیں ہیں، جن سے کوئی کتاب خالی نہیں ہوتی،

مصنف نے جامعہ ملیہ اور حکیم اجمل خان کی کوششوں کا علی گڈھ تحریک کے ضمن میں ذکر کیا ہے، جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے، (ص ۱۰۰) لیکن کیا یہ ہلکی سی فروگذاشت اس صریح غلطی سے

کوئی نسبت رکھتی ہے، جو (Whither Islam[1]) میں ہندوستان کے مقالہ نگار نے ندوہ کے متعلق کی ہے، (ملاحظہ ہو کتاب مذکور ص ۱۹۳)

وہ لکھتا ہے:-

"سرسید کی دوسری کوشش لکھنؤ میں ندوۃ العلماء اور اس کے دار العلوم کی تاسیس تھی، اس کا مقصد الخ"

پورا بیان درست ہے، لیکن ندوہ کی نسبت سرسید مرحوم کی طرف کرنا، اس سے زیادہ اور کیا اندھیر ہو سکتا ہے، ؟ یہ مقالہ نگار کوئی انگریز افسر ہے، جو ہندوستان میں سالہا سال زندگی بسر کر چکا ہے، اگر بیچارہ ذکی علی جنیوا میں بیٹھ کر جامعہ کو علی گڈھ سے الگ نہ دکھا سکا، تو کیا تعجب ہے،

بہرحال کہنا یہ تھا کہ ذکی علی ہندوستان اور یہاں کے مسلمانوں کو ٹھیک ٹھیک سمجھے ہیں، اور جو کچھ لکھا ہے، کافی پڑھ کر لکھا ہے، ذیل کے ملخص اقتباس سے صحیح اندازہ ہوگا:-

"سترہویں صدی عیسوی میں سارا ہندوستان مغلیہ حکومت کے زیر سایہ آگیا، اسلام کی عظمت کا سکہ ملک کے طول و عرض میں بیٹھ گیا، آخری دور میں حکومت کی بنیادیں کمزور ہو گئیں، لیکن اسلام ایک مذہب کی حیثیت سے ملک کی رگ و پے میں پیوست ہو چکا تھا، آج وہاں آٹھ کروڑ سے زیادہ مسلمان آباد ہیں،

گو مسلمان تعلیم میں پیچھے رہ گئے، لیکن پھر بھی کوششیں جاری ہیں، سرسید احمد خان نے علی گڈھ میں اپنی یونیورسٹی قائم کی، اور موجودہ روشنی کے مطابق انھوں نے اسلامی افکار کی ترجمانی کی" (ص ۸-۳۴۷)

[1] یہ کتاب لندن سے ۳۲ء میں پروفیسر (H. A. R. Gibb) کے زیر اہتمام شائع ہوئی ہے، اسمیں مختلف ملکوں پر جدا جدا مقالات ہیں،

"ثقافتی بیداری کے ساتھ ساتھ مسلمانانِ ہند سیاست میں بھی دلچسپی لینے لگے، ۱۹۱۲ء[۱] میں مسلم لیگ کی تاسیس ہوئی، ہندوستان کی سیاسی حالت نے ملک کی دو اہم قوموں کو ایک دوسرے سے قریب کر دیا ہے، ہندو مسلم تعلقات کی تفصیلات میں ہم اس وقت نہیں پڑ سکتے، ہندو مسلمانوں کی باہمی آویزش کی مختلف اجتماعی، مذہبی، معاشی اور سیاسی توجیہیں کی گئی ہیں،

مصنف نے ایک مغربی اہل قلم (Clifford manshart) کی رائے ہندو مسلم مسئلہ پر نقل کی ہے، یہ رائے اس حد تک ضرور صحیح ہے، کہ آیندہ یہ اختلافات زیادہ سے زیادہ طبقاتی جنگ (Class struggle) کی شکل اختیار کرتے جائیں گے، لیکن اس سے "تہذیبی برتری" کی جنگ بند نہیں ہو سکتی، اس مغربی مصنف کی تحریر میں ایک غلط بیانی یہ بھی ہے، کہ افغان سود خوار اور ہندو مہاجنوں کو ایک حیثیت حاصل ہے، (ص ۳۴۹) جس قدر مسلمان پیشہ ور اور زمیندار ہندو مہاجنوں کے مقروض ہیں اس کا عشر عشیر بھی ہندو عوام افغان سود خواروں کے دست نگر نہیں،

ہندو مسلم مسئلہ کے متعلق ایک مسلمان مصنف (رحمت علی صاحب[۲]) کی یہ رائے بھی سننے کے لائق ہے، جو "نیشنلسٹ" زاویہ نگاہ کی ترجمانی کرتی ہے،:-

"برطانوی استعمار پسند اس اختلاف کی علت ہندوستانی عوام کا مذہبی جنون قرار دیتے ہیں، ہندوستانی قومیت اسے برطانوی شہنشاہیت کی پیداوار سمجھتی ہے"

(ص ۳۴۹)

مصنف نے اس پیچیدہ مسئلہ پر ہر نقطۂ نگاہ کو سمجھنے کی کوشش کی ہے، متحدہ قومیت

[۱] مسلم لیگ کی تاسیس ۱۹۰۶ء میں ہوئی، البتہ زندگی ۱۹۱۲ء کے بعد پیدا ہوئی [۲] رحمت علی صاحب کی کتاب فرنچ میں ہے، اور ۱۹۳۳ء میں پیرس سے شائع ہوئی ہے،

کے علم برداروں کی طرف سے بسنت کمار رائے کے ایک مضمون (شائع شدہ "اورینٹ" نیویارک نومبر ۱۹۳۴ء) کا اقتباس دیا گیا ہے، (ص ۳۵۱) بہرحال مصنف کو توقع ہے کہ

"ایک وسیع الخیال نظام تعلیم اور دونوں جماعتوں کے باہمی تعاون سے آزاد ہندوستان میں فرقہ وارانہ نزاع کا مستقل حل ہو سکے گا"، (ص ۳۵۲)

مسلمانانِ ہند کی بین الملی ہمدردی اور مسلمانانِ عالم کی فلاح و بہبود سے ان کی دلچسپی کا تذکرہ بھی مناسب الفاظ میں کیا گیا ہے،

انڈونیشیا میں بھی تبدیلی ہو رہی ہے، مشرق قریب سے اس کے تعلقات روز بروز پائدار ہوتے جا رہے ہیں، مذہبی اور قومی تجدید و اصلاح کے لئے متعدد انجمنیں کام کر رہی ہیں جن میں انجمن شرکت اسلام، اور محمدیہ پارٹی خاص طور پر ممتاز ہیں، سورابایا، اور بٹاویا نشر و اشاعت کے مرکز ہیں، ولندیزی حکومت کا برتاؤ ان کے ساتھ اچھا نہیں، کوئی دینی و قومی تحریک وہ انگیز نہیں کر سکتی، اور مسیحی مشنریوں کی کھلم کھلا حوصلہ افزائی کیجاتی ہے،

جاپان میں اسلام کی ترقی کے امکانات کی طرف بھی مصنف نے اشارہ کیا ہے، (ص ۳۵۳) چین کے سلسلہ میں الازہر سے چینیوں کے تعلقات کا مصنف نے خاص طور پر ذکر کیا ہے، یہ واقعہ ہے کہ مصری حکومت بلکہ شاہ فاروق کا چینی طلبہ پر بڑا احسان ہے، تقریباً بیس چینی طالب علم شاہ مصر کے صرف پر ازہر میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں، متعدد مصری معلم ازہر کی طرف سے پیکنگ بھیجے گئے ہیں، اور اس طرح پر عربی زبان اور اسلامی علوم کی ترویج کے لئے ایک مستقل زمین تیار ہو رہی ہے،

اشتمالی روس اور اسلام

ترکی کی طرح روس کے متعلق بھی ہندوستان میں عام طور پر کسی بات پر یقین نہیں کیا جاتا، پوچھ کیجئے، جواب ملے گا "یہ سب انگریزوں کا پروپیگنڈا ہے"، "سوشلزم" کی ظاہری "خوبیوں" پر مسلمان

نوجوان اس قدر فریفتہ ہیں کہ وہ اس کے نظری پہلو (Philosophical aspect) کا مطالعہ بھی نہیں کرنا چاہتے، اور جو دو چار مطالعہ کے بعد مکمل سوشلسٹ بن چکے ہیں وہ سیاسی سربلندیوں[1] کی خاطر اپنے عقائد صاف صاف بیان نہیں کرتے،

یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ مارکس کی تعلیمات میں وجود باری کی کہیں گنجایش نہیں تاریخ کی مادی تعبیر کا نظریہ روحانیت کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکتا ہے، جب ایک مارکس کا پیرو رسول کریمؐ اور دیگر انبیاے کرام کی تعلیمات کو بھی مادہ اور روٹی کا جامہ پہنانا چاہتا ہے، تو پھر مذہب اور روحانیت کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے، اس میں شک و شبہہ کی گنجایش نہیں، کہ اشتراکیت یا اشتمالیت انکار ربوبیت کی طرف رہنمائی ضرور کرتی ہے، اگر یہ حوصلہ افزائی نہ ہوتی، تو روس میں آج وسیع پیمانہ پر مخالف الوہیت تحریک (انٹی گاڈ مومنٹ) ہرگز نشو ونما نہ پاسکتی،

مارکس اور سوشلزم کے تجزیہ اور تحلیل کا یہ موقع نہیں، کہنا صرف یہ ہے کہ نئی چیزوں کی ظاہری چمک دمک سے مسحور ہونے کی جگہ ہمیں ان کی حقیقتوں کا پتہ لگانا چاہئے، اور پھر ان نتائج کو شریعت اور عقلِ سلیم کی کسوٹی پر کس کر جانچنا چاہئے، ورنہ روشن خیالی اور عقلیت کے دعوے سب غلط اور صرف دکھاوے کے ہیں،

گو یہ موقع مارکسزم (Marxism.) یا سوشلزم کی تنقید[2] و تحلیل کا نہیں، پھر بھی مذہب کے متعلق مارکس اور اس کے پیرووں کا رویہ واضح کرنے کے لئے ہم ذیل میں ایک مشہور کیمونسٹ کی ایک تحریر کا اقتباس پیش کرتے ہیں، کامریڈ ام، ان، راے ہمارے وطن کے

[1] ابھی جداگانہ طریق انتخاب باقی ہے، اس لئے سیاسی سربلندیاں مسلمان ووٹروں کی مرضی کے بغیر نہیں حاصل ہوسکتیں [2] اس موضوع پر حافظ فضل الرحمٰن صاحب انصاری کا ایک گران قدر مضمون "مدینہ"، ارجولائی ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا ہے، یوں خود سوشلزم کی بائبل (Das Kapital) بازاروں میں ملتی ہے،

مشہور انقلابی رہنما ہیں، اور عرصہ تک کیمونسٹ انٹرنیشنل کے سرگرم کارکن رہ چکے ہیں، ہندوستانی کیمونسٹوں میں کوئی ان کی ہمسری کا ادعا نہیں کرسکتا، وہ گاندھی ازم، اور سوشلزم کا مقابلہ کرتے ہوے فرماتے ہیں، :-

"سوشلزم کا فلسفہ مادیت ہے، جو مذہب کو پس پشت ڈال دیتی ہے، اور روحانیت کو تسلیم نہیں کرتی، دوسرے لفظوں میں زندگی اور مخلوقات کے مذہبی نظریہ کی تردید کرتی ہے، سوشلزم اور مارکس کی تعلیمات کا بنیادی جزء مادیت باصول تضاد[3] (Dialectical materialism) پر مبنی ہے، .... پہلے فلسفہ کے ذریعہ دنیا کی تشریح کیجاتی تھی، لیکن مستقبل میں اس کا منصب بدل جائے گا، اب یہ دکھانے کی کوشش کیجائے گی، کہ انسان کس طرح دنیا کی دوبارہ تعمیر کرسکتا ہے، .... اس کے معنی یہ ہوئے کہ مارکس کے فلسفہ میں انسان کسی قدرتی طاقت کے ہاتھ میں آلہ کار نہیں ہے، انسان اس دنیا کا جس میں وہ رہتا ہے، خالق ہے، انسان سوسائٹی کا خالق ہے،

یہ ایک طویل خطبہ کے اقتباسات ہیں، جو ان کے اخبار "انڈی پنڈنٹ انڈیا" (۲۲ جنوری ۳۹ء) میں شائع ہوئے ہیں، بحث کے آخر میں ارشاد ہوتا ہے، :-

"بہرحال ایک شخصی خدا (Personal God) کا عقیدہ ہو یا عبادت کی تاثیر کا، یا عالم کا مذہبی تصور ہو ...... یہ بالکل واضح ہے، کہ ان تصورات میں سے کوئی بھی کسی طرح مارکسی نظریہ زندگی اور انسانی جدوجہد سے میل نہیں کھاسکتا،"

روس میں بیس سال سے مسلمانوں پر جو کچھ بیت رہی ہے، اس سے بحمد اللہ ہم واقف ہیں،

[3] عام طور پر اس فقرہ کا ترجمہ "مادیت بالضد" کیا جاتا ہے لیکن اس سے مفہوم واضح نہیں ہوتا،

آج کی صحبت میں مصنف کے بیانات کا خلاصہ درج کرنے پر اکتفا کرتے ہیں، جو کافی مطالعہ اور تحقیق و جستجو کا نتیجہ ہیں، :-

سویت روس کے علاقوں میں تقریباً تین کروڑ مسلمان آباد ہیں، جو مسلسل بالشویک پروپگنڈا اور سختی کے باوجود اپنی جگہ پر قائم ہیں،

"روس نے اسلام کے مقابلہ میں دورخی حکمت عملی اختیار کی، باکو کانگریس (۱۹۲۰ء) کے فیصلہ کے مطابق انھوں نے مشرقی دنیا میں اپنے کو مظلوموں کا ہمدرد اور غریبوں کا نجات دہندہ مشہور کیا، داخلی حکمت عملی اس کے خلاف تھی، اسٹالن کی تشریح (۱۹۲۱ء کی رپورٹ) کے مطابق، اس کا مقصد مذہبی تنظیم کو ختم کرنا، اور تورانیت کی تحریک کو کمزور کرنا تھا، مخالف الوہیت تحریک سارے روس میں اسلامی نظام کو ختم کرنا چاہتی ہے، قفقاز اور وسط ایشیا میں مسلمانوں کی مدافعت کے باعث، یہ تحریک کامیاب نہیں ہو رہی ہے، ایک کمیونسٹ مصنف کے اقرار کے بموجب،

"نسبتہً گرجوں کا بند کر دینا آسان ہے، لیکن مسجدوں کا معاملہ اس سے جدا ہے، جن کے ختم کرنے کے لئے کافی عقل و فہم کی ضرورت ہو"

بیت المقدس کی موتمر اسلامی (دسمبر ۱۹۳۱ء) میں عیاض اسحاق (جو رسالہ Yeni Mili Yol برلن کے ڈائرکٹر اور مختلف انجمنوں کے صدر ہیں) نے مسلمانان روس کی حالت پر ایک رپورٹ پڑھی تھی، یہ رپورٹ اطالوی رسالہ (Oriente Moderno) (مارچ ۱۹۳۳ء) میں شائع ہوئی تھی، اس پر مسلمانوں پر بیجا سختیوں کی مثالیں اور تفصیلات دی گئی تھیں، اصل یہ ہے کہ مذاہب کی مخالفت اور بیخ کنی ماسکو کے بنیادی عقائد میں شامل ہے،

"روسی ترکستان بالشویک پروپگنڈا کا اہم مرکز ہے، مرحوم انور پاشا یہیں ایک بالشویک ایجنٹ کے ہاتھ سے شہید ہوئے، تاشقند جس کی آبادی آج پانچ لاکھ ہے، بالشویک ایشیا کا معاشی اور تہذیبی مرکز ہے، ان کی اہم جماعتوں کے مرکزی دفاتر یہیں ہیں، یہاں تبلیغی اسکول اور کالج بھی ہیں، یہیں سمرقند کے جامع مسجد کا منارہ[1] منہدم کر دیا گیا ہے، اور اسکی جگہ لینن کا عظیم الشان مجسمہ نصب کیا گیا ہے، جس پر یہ الفاظ کندہ ہیں"،

"آج کے بعد موذن مومنوں کو اس منارہ سے (عبادت کی) دعوت نہیں دیگا بلکہ ....لینن"،

"کومنترن (کمیونسٹ انٹرنیشنل) شمالی افریقہ اور مشرق قریب میں مسلمان مزدوروں پر اثر انداز ہونے کی پوری کوشش کر رہا ہے لیکن یہ حقیقت سامنے رہنا چاہئے، کہ مسلمانوں اور اشتراکیوں میں کبھی اشتراک عمل[2] نہیں ہو سکتا،

افسوس کہ ہندوستان میں بعض مسلمان (بلکہ علما بھی) اشتراکی دہریوں کیساتھ سیاسی میدان میں اشتراک عمل کر رہے ہیں، میرے خیال میں یہ غلط روا داری مسلمانوں کی یکجہتی کیلئے سم قاتل ثابت ہوگی،

شمالی روس کے حالات کا جائزہ اس سلسلہ کی آخری کڑی ہے، اس کے بعد اسلام اور بین الاقوامی تعلقات (ص ۲۰۸-۲۶۱) پر مصنف نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے، اور بین الاقوامی سیاسیات میں مسلمانوں کی اہمیت واضح کی ہے، جنگ عظیم سے پہلے مسلمان اور

---

[1] بعض عینی شاہدوں نے بھی اسکی تصدیق کی ہے۔ [2] چند سال ہوئے شمالی افریقہ کے متعلق وہاں کے ہر دلعزیز نوجوان لیڈر (حسن ابو عیاد) نے اپنے ایک فاضلانہ مضمون نحن المغاربة، مسلمون اعداء الشیوعیة والاستعمار میں یہ حقیقت اچھی طرح واضح کی تھی، (الفتح ۱۳۵۱ھ ہجری)،

مسلم حکومتیں انتہائی بُری حالت میں تھیں، صحیح معنوں میں کوئی ملک آزاد نہیں تھا، عثمانی حکومت ہارمان کے لڑ رہی تھی، جنگ عظیم کے بعد نقشہ بدل گیا، کمالی ترکی پھر تازہ دم ہو کر میدان میں آگئی، ایران و افغانستان نے چولا بدلا، عربی علاقے بیدار ہوئے، ابن سعود کی بیدار مغزی سے جزیرۃ العرب کا ایک بڑا حصہ فتنہ و فساد سے محفوظ ہوگیا، عراق و مصر آزاد ملکوں کی صف میں داخل ہو چکے ہیں، شام کا قضیہ بھی طے ہوا چاہتا ہے، خلاصہ یہ کہ اس وقت آزاد مسلم حکومتوں کی ایک کافی تعداد نظر کے سامنے ہے، جو علاقے اب تک پابند قفس ہیں، وہ بھی جد وجہد سے غافل نہیں،

یہ سب سہی پھر بھی آبادی کے لحاظ سے مسلمانان عالم کی اکثریت آج تک دوسروں کی غلام ہے، دس کروڑ سے زیادہ مسلمان برطانیہ کے زیرنگیں علاقوں میں آباد ہیں، فرانس کی مملکت میں چھ کروڑ کے لگ بھگ ان کی آبادی ہوگی، اسی طرح ولندیزی مقبوضات میں کلمہ گویوں کی تعداد پانچ کروڑ ہے، روس میں تین کروڑ حلقہ بگوشان اسلام موجود ہیں، اطالوی مقبوضات میں بھی مسلمانون ہی کی آبادی زیادہ ہے،

یہ علاقے ان استعماری حکومتوں کے لئے بڑی اہمیت رکھتے ہیں، صرف الجزائر میں فرانسیسی مال تجارت کی اس قدر کھپت ہے جتنی انگریزی مصنوعات کی ہندوستان میں نہیں، خلیج فارس کا ساحلی علاقہ برطانوی ہوائی رہ گذر ہے، اس کی اہمیت دوران جنگ میں اور بڑھ جائے گی، اس فوجی اور ہوائی رہ گذر میں ابن سعود سے دوستانہ تعلقات رکھے بغیر کوئی توسیع نہیں ہوسکتی، عرب حکومتوں کو رام کئے بغیر اب بحر روم میں توازن قائم رکھنا دشوار ہے، اگر ہندوستان اور شمالی افریقہ میں بین الاقوامی پرزور تحریکیں ہوں، تو برطانیہ اور فرانس کو مسلمانوں کے بین الاقوامی مفاد کا لحاظ کرنا پڑیگا،

یہ خلاصہ ہے مصنف کے افکار و خیالات کا، آغاز میں انھوں نے نہایت مدلل طرز بیان میں اسلام کی بین الاقوامی تعلیمات اور مسلمانوں کی یک جہتی پر زور دیا ہے، ان کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے

اسلام کے قوانین اور معتقدات، جیسا کہ ابھی بیان کیا گیا، مسلمانوں کی روزمرہ کی زندگی، حکومت، سیاسی حکمت عملی، اور تجارت سب پر یکساں اثرانداز ہوتے ہیں، اس لئے اگر مسلمان یہ محسوس کریں کہ ان کا مذہبی وقار خطرہ میں ہے، تو بآسانی مخالفانہ تحریکیں اٹھائی جاسکتی ہیں، (صفحہ ۳۶)

اسی بنیاد پر مصنف کے نزدیک بین الاقوامی سیاسیات میں مسلمانوں کی بڑی اہمیت ہے، اس سلسلہ میں انھوں نے متعدد مثالیں بھی دی ہیں،

"وحدت عربیہ" یا اتحاد عرب کی تحریک پر مصنف نے سیر حاصل گفتگو کی ہے، انکے خیال میں اس خواب کی تعبیر دشوار نہیں، (۳۰۲-۳۶۹)

احیاے خلافت کا فوری امکان ابھی نہیں عزیز علی مصری کے خیال میں بھی مصر کی سیاسی کمزوری کے باعث شاہ فاروق سردست اس کے اہل نہیں، پھر بھی بیت المقدس کی موتمر اسلامی (۳۱ء) اور یورپین مسلم کانگریس (۳۴ء) اور اس قسم کی دوسری بین الاقوامی کانفرنسوں سے مسلمانان عالم کی سیاسی قوت میں اضافہ ہونا لازمی ہے،

فلسطین کے سلسلہ میں عربوں کی یکجہتی بھی بطور دلیل کے پیش کیجا سکتی ہے، ایران کے ایک شیعہ عالم (ابو عبداللہ زنجانی، رکن المجمع العلمی العربی، دمشق) نے "اتحاد اسلام" پر مصر میں ایک پرمغز خطبہ دیا تھا، اس کا بھی مصنف نے بطور فال نیک کے ذکر کیا ہے، بہرحال کتاب کے دوسرے حصوں کی طرح یہ باب بھی پرمغز اور پڑھنے کے لائق ہے،

کتاب کے آخری باب (دنیا میں اسلام ص ۴۱۰-۳۷۹) میں مصنف نے اس طرح گذشتہ ابواب کا جائزہ لیا ہے کہ ایک مختصر مضمون میں انھوں نے تمام کتاب کا خلاصہ پیش کر دیا ہے، طرز بیان کی دلنشینی اس پر مستزاد ہے،

اس تلخیص کے بعد انھوں نے "اسلام اور یورپ کی باہمی مفاہمت کے امکانات پر سنجیدگی کے ساتھ بحث کی ہے، اور مفید باتین بیان کی ہیں لیکن ہمیں ان سے دلچسپی نہیں ہوئی، ہم اپنی طرف سے لاکھ صلح و مفاہمت کی تجویزیں اور اخلاقی معیار پیش کرین لیکن ادھر سے پیش قدمی نہیں ہو سکتی، جب تک مسلمان اور مشرق کی قومیں اہلِ یورپ کی زبان (اسلحہ) میں ان سے گفتگو نہیں کرتیں، کسی مستقل مفاہمت کا امکان نہیں،

آخر مین (ص ۴۱۸-۴۱۱) لائق مصنف نے مسلمانانِ عالم کی آبادی کے متعلق صحیح اعداد و شمار فراہم کرنے کی کوشش کی ہے، اور تفصیل کے ساتھ ہر ایک ملک اور علاقہ کے اعداد الگ الگ دئے ہیں، جن ملکوں میں باضابطہ مردم شماری نہیں ہوئی ہے وہان کے اعداد تقریبی ہیں، اس میں بھی حتی الوسع کم از کم تخمینہ کیا گیا ہے، مثال کے طور پر چین اور چینی ترکستان (منگولیا، اور تبت کے درمیانی علاقے اس میں شامل ہیں) کی کل آبادی مصنف نے ۵ کرور لکھی ہے، حالانکہ واقف کار چینی مسلمان صرف چین کے مسلمانوں کی تعداد ۵ کروڑ بتاتے ہیں، اسی طرح مسلمانان حبشہ کی آبادی مصنف نے پچاس لاکھ (۵۰ فی صدی) بتائی ہے، حبشہ کی صحیح آبادی جو کچھ بھی ہو لیکن مسلمانوں کی آبادی پچاس فی صدی سے زیادہ ضرور ہے، اس محتاط تخمینہ کے مطابق مسلمانانِ عالم کی آبادی ۴۴ کرور ہوتی ہے،

مختلف علاقوں کے صحیح اعداد و شمار نہ ہونے کی صورت میں، تخمینے مختلف ضرور ہوں گے لیکن یورپین ماہرینِ فن تو بسا اوقات سرکاری رپورٹوں میں دئے ہوئے اعداد میں بھی تخفیف کر دیتے ہیں، اس کے برعکس مسلمان کبھی پچاس کرور اور کبھی ساٹھ کرور بتاتے ہیں، صحیح تخمینہ اور تلاش و جستجو بہت کم کی جاتی ہے،

اس سے پہلے ہم نے خود الضیاء (جلد ۱ ع) میں "مسلم ریوائول" لاہور، اور بعض دوسرے

انگریزی رسالوں کی امداد سے اعداد مرتب کئے تھے، تخمینہ چالیس کرور کے لگ بھگ ہوتا تھا، اسکے بعد "حاضر العالم الاسلامی" کے جدید ایڈیشن (جلد ۳ ص ۳۶۵-۳۶۷) میں امیر شکیب کے مرتب کردہ اعداد نظر سے گذرے، امیر البیان کے تخمینہ کے مطابق مسلمانانِ عالم کی آبادی (۳۲ء) مین سینتیس کرور کے لگ بھگ تھی، امیر شکیب ارسلان بھی کم سے کم تخمینہ کرتے ہین، ڈاکٹر زکی علی نے یہ اعداد ۳۷ء میں مرتب کئے ہین، اسلئے قدرتی طور پر تعداد میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہونا چاہئے تھا، ان کے اعداد امیر البیان کے مرتب کردہ اعداد سے زیادہ مفصل اور واضح ہیں، نمونہ کے طور پر امیر البیان نے مراکش کی مجموعی آبادی اسّی لاکھ بتائی ہے، ڈاکٹر زکی علی نے مراکش کی مردم شماری اس طرح کی ہے؛

مراکش (فرانسیسی منطقہ)	(پچاس لاکھ)
" (مغرب اقصی)	
" (فرانسیسی منطقہ)	(")
" (اسپینی منطقہ)	(سات لاکھ)

اس تفصیل سے کل آبادی ایک کرور سات لاکھ ہوئی، اسی نوعیت سے تمام ملکوں کی تفصیل کی گئی ہے، مراکش کے اعداد میں اتنا نمایاں فرق نئی مردم شماری کے باعث ہے،

اس قدر خامہ فرسائی کے بعد تلخیص اور تخمینہ نگاری سے قلم کو فرصت ہوتی ہے، میری کوشش مشکور ہو گی، اگر دو چار اصحاب بھی اصل کتاب کو پڑھ لیں، اور ان اہم مسائل پر جو آج مسلمانانِ عالم کے سامنے درپیش ہیں، غور و فکر کی کوئی نئی راہ نکالنے کی کوشش کریں،

تلخیص و تبصرہ

مزاج کا مطالعہ

اشخاص کے مزاج کی تین قسمیں ہوتی ہیں، ایک وہ جو اپنی طبیعت کی اندرونی کیفیات (Introvert.) کے مطالعہ کے عادی ہیں، دوسرے وہ جو صرف اپنی ظاہری کیفیات (Extravert.) کا مطالعہ کرتے ہیں، تیسرے وہ جو اپنی دونوں کیفیتوں (Ambivert.) پر نظر رکھتے ہیں۔

اگر کوئی شخص دوستوں کے ساتھ گھومنے پھرنے کے بجائے، گھر میں بیٹھ کر دلچسپ کتابیں پڑھتا ہو، اجنبیوں سے ملنے میں گھبراتا ہو، اپنے اوپر بیجا اعتراض سے کبیدہ خاطر ہوتا ہو، اپنے کپڑے اور ظاہری شکل کا زیادہ خیال رکھتا ہو، کسی اہم بات کا فیصلہ کرنے میں دوسروں کی رائے پسند نہ کرتا ہو، خاموشی سے سوچتے سوچتے مضمحل ہو جاتا ہو، کئی دوستوں کے بجائے صرف ایک مخلص دوست سے انس اور محبت رکھتا ہو، کسی کام کو شروع کرنے سے پہلے اسکے ہر پہلو کو اچھی طرح سوچتا ہو، کسی بات کا فیصلہ کرنے سے پہلے اسکی اہمیت سے زیادہ اپنے اصول کو پیش نظر رکھتا ہو، تو اس کا مزاج اول الذکر قسم کا ہے، وہ فطری طور پر خاموش، جفاکش، حساس اور عزلت پسند ہوتا ہے وہ زیادہ تر خواب و خیال کی دنیا میں رہنا پسند کرتا ہے، اس مزاج کے لوگ تصنیف و تالیف، تلاش و تحقیق، آرٹ اور ایجاد کے زیادہ دلدادہ ہوتے ہیں، لیکن اس قسم کا مزاج متوازن نہیں

ہوتا ہے، اس میں توازن پیدا کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے، کہ ایسے مزاج والے اشخاص کو جسمانی ورزش خوب کرنا چاہئے، جسمانی ورزش کی تفریح میں ان کے دماغ کے رجحانات تخیل کی اونچی دنیا سے اتر کر ایک مناسب سطح پر آجاتے ہیں، ایسے مزاج کے لوگوں میں دماغی یکسوئی رہتی ہے، وہ اپنے ماحول سے دلچسپی پیدا کر کے اس ناخوشگوار پہلو کو دور کر سکتے ہیں، اسکے لئے دوستوں سے ملنا، مصیبت میں ہمسایوں سے ہمدردی کرنا، مجلس مباحثہ و مناظرہ میں حصہ لینا مفید ہے، اس قسم کی باتوں سے اپنی ذات کے ضرورت سے زیادہ احساس کو کم کرنے کا موقع ملتا ہے، جس سے اندرونی کیفیات کے مطالعہ کی شدت میں کمی ہوتی ہے،

دوسری قسم کے مزاج کے وہ لوگ ہیں جن کو اپنے دوستوں سے اپنی زندگی کے واقعات اور تجربات بیان کرنے میں لطف آتا ہے، ان کو لوگوں کے سامنے اپنی رائے ظاہر کرنے میں جھجک نہیں ہوتی، نئے نئے لوگوں سے ملنے جلنے میں خاص مہارت رکھتے ہیں، اجنبیوں سے بھرے ہوئے کمرہ میں داخل ہونے میں حجاب نہیں کرتے، اپنی پسندیدگی اور ناپسندیدگی میں متشدد ہوتے ہیں، کسی بات کا نفی میں جواب دینے میں نہیں گھبراتے، مواقع سے ہر قسم کا فائدہ اوٹھاتے ہیں مباحثوں میں جلد مشتعل اور برافروختہ ہو جاتے ہیں، ان کے دوستوں کا حلقہ جتنا زیادہ وسیع ہوتا ہے، اتنا ہی زیادہ ان کو زندگی کا لطف ملتا ہے،

ایسے لوگ فطرۃً ہمیشہ خوش رہتے ہیں، ان کو کوئی غم اور فکر نہیں ہوتا، عام طور سے وہ کھلاڑی، اداکار، تماشوں کے منتظم، اور میزبان بہترین ہوتے ہیں، لیکن ان کے لئے بھی چند نفسیاتی ہدایتیں ہیں، جنکے ذریعہ وہ اپنے مزاج کی اصلاح کر سکتے ہیں، عام طور سے ان کو اپنے مشاغل کی سطحی دلچسپی ہوتی ہے، اسلئے وہ اپنی تمام قوتوں کو معاشرتی زندہ دلی میں برباد کر دیتے ہیں، جو صحیح نہیں ہے، انھیں اپنی جسمانی اور ذہنی قوتوں کو مجتمع کرنا چاہئے، تاکہ ان میں آزادی اور ذمہ داری

کا احساس ہو اور جب وہ کسی کام کو شروع کریں، تو اس کو آخر تک پہونچائیں، اور جس کام میں کامیابی کی امید نہ ہو، اس کو ہاتھ نہ لگائیں، ان کے لئے کھانے پینے، بولنے چالنے، اور معاشرت کی دوسری دلچسپیوں میں حصہ لیتے وقت ضبط اور احتیاط بھی ضروری ہے، تاکہ انکی گفتگو سے کسی شخص کی ذات پر حرف گیری نہ ہو، اور ان کے کام سے ناخوشگوار صورتیں نہ پیدا ہو جائیں،

تیسری قسم کے لوگون کا مزاج بہت متوازن ہوتا ہے، یہ لوگ طبعاً نہ جنگجو ہوتے ہین، اور نہ عزلت پسند، وہ زندگی کے تمام مسائل کی پیچیدگیون کو آسانی سے سلجھا لیتے ہین، ہر قسم کے لوگون سے تعلقات قائم کرسکتے ہیں، ان کے کام میں دقت اور رکاوٹ کم پیدا ہوتی ہے، ایسے لوگ، استاذ، باپ، کپتان، اور تیماردار کے فرائض نہایت کامیابی کے ساتھ انجام دیتے ہیں، مگر بعض اوقات ان کے مزاج کا رجحان مذکورۂ بالا دو قسموں میں سے کسی ایک کی طرف ہو جاتا ہے، اس میلان کو روکنے کی آسان صورت یہ ہے کہ جب وہ اس قسم کا خطرہ محسوس کریں، تو ان کو فوراً کسی دلچسپ مشغلہ میں مصروف ہو جانا چاہیئے،

"ص ع"

مبادی فلسفہ جلد اوّل

یہ مولینا عبد الماجد دریابادی کے مختلف فلسفیانہ مضامین کا جن کی تعداد ۹ ہے، مجموعہ ہے مجموعہ دلچسپ اور ان کا طرز بیان رواں و شگفتہ ہے، ۱۰۵ صفحے قیمت :- عہ

مبادی فلسفہ جلد دوم

یہ مولینا کے سات فلسفیانہ مضامین کا مجموعہ ہے، جو نظر ثانی کے بعد اس میں جمع کئے گئے ہین، ضخامت ۱۰۱ صفحات، قیمت ۱عہ

"منیجر"

اخبار علمیہ

سقراط کے متعلق ایک نئی رائے

اب تک اہل علم کو یہی معلوم تھا، کہ سقراط ایک بڑا فلسفی اور معلم تھا، جسکو ایتھنز کے نوجوانون کو گمراہ کرنے کے الزام میں موت کی سزا دیگئی، افلاطون نے جو اسکی قلمی تصویر لی ہے اسکی بنا پر گذشتہ ۲۳۰۰ برس سے یہی سمجھا جاتا تھا کہ وہ ایک مرتاض فلسفی تھا، جس نے ریاضت میں زندگی بسر کی، بازارون میں ایتھنز کے باشندون کے مدنی، تعلیمی، اور معاشرتی مسائل کی تحقیقات کی، یونانی سوفسطائیون کو ان کی غلطیون سے آگاہ کیا، اور عملی سیاست سے پرہیز کرتا رہا، مگر آخر میں ناواقف اور جاہل عوام نے اسکو محض اسلئے "جام شہادت" پلایا کہ وہ اپنے شاگردون کو انصاف اور اقتدار کی تعلیم دیتا تھا،

لیکن امریکہ کے ایک پروفیسر البن ڈیویس ون اسپیر نامی نے حال ہی میں ایک کتاب "سقراط کون تھا" (Who was Socrates ?) شائع کی ہے جس میں سقراط کے متعلق عجیب وغریب اور نئے معلومات پیش کئے ہین، پروفیسر موصوف نے ارسٹوفینیس (Aristophanes) کے ڈرامہ "بادل" (The Clouds) میں سقراط کی تصویر بالکل مختلف دیکھی، اس نے سقراط کو سوفسطائی اور ایک ان پڑھ جماعت کے ناموزون رہنما کی حیثیت سے پیش کیا ہے، جس کے اثرات اپنی جماعت پر ناخوشگوار تھے، پروفیسر مذکور کی مندرجۂ بالا کتاب افلاطون اور ارسٹوفینیس کے متضاد بیانات کا مندرجۂ ذیل تجزیہ کیا ہے،

ارسٹوفنیس نے اپنا ڈرامہ سنہ۴۲۳ء ق م میں لکھا ہے، جب سقراط، ۴۵ سال کا اور افلاطون محض چھ برس کا بچہ تھا، افلاطون سقراط سے سنہ۴۰۷ ق م میں وابستہ ہوا، وہ عوام کی جماعت سے نفرت کرتا تھا، اسلئے جب اس نے سقراط کی زندگی کے حالات لکھے، تو اس کے ان پچھلے ستر برس کے واقعات کو جب کہ وہ عوام کا رہنما تھا، نظرانداز کر دیا، پروفیسر ابن کا خیال ہے، کہ سقراط جوانی میں انقلابی اور باغیانہ خیالات رکھتا تھا، لیکن اپنی آخر زندگی میں قدامت پسند اور یونانی جمہوریت کا مخالف ہو گیا، نسلاً وہ ایک سنگ تراش کا لڑکا تھا، بچپن میں اسکی تعلیم سوفسطائیوں کی صحبت میں ہوئی، اسلئے شروع میں ایک مفلس اور قلاش جمہوری تھا، لیکن جب اسکی شہرت بڑھی، تو وہ طبقہ امرا کا جلیس بن گیا، اور ان سے نذر قبول کرنے لگا، ریاضت کم کر دی، اور ادنی ادنی عورتوں سے شادی کر لی، جب وہ پچاس برس کا ہوا، عوام اس سے منحرف ہو گئے، اور وہی نوجوان اس کی اقتدا میں تھے، جو ایتھنز کی جمہوریت کے خلاف شورش کر رہے تھے،

سقراط کا ایک شاگرد کریٹی اس استاد سے باغی ہو کر جمہوریت پسند طبقہ کا آمر بن گیا، ایتھنز کے امرا نے جب اپنی حکومت قائم کی، تو اوس نے تیس آدمیوں کی آمریت کر خونیں ہنگامہ بپا کیا، جس میں ڈیڑھ ہزار باشندے مارے گئے، اور بالآخر پھر جمہوریت قائم ہو گئی، اس جمہوری حکومت میں امرا اور ان کے تمام حامیوں کا قلع قمع کیا گیا، اسی سلسلہ میں سقراط کو بھی موت کی سزا دی گئی،

"ص ع"

برکلے اور اس کا فلسفہ

مشہور فلاسفر برکلے کے حالات زندگی، اور اسکے فلسفہ کی تشریح، اردو میں فلسفہ جدید کی پہلی کتاب ہے، ضخامت ۱۲۶ صفحے، قیمت: ۔عہ/

"منیجر"

ادبیات

جام صہبائی

از جناب آثر صہبائی،

اے ہوش ربا نگاہ والے! آنکھیں ہیں کہ مدھ بھرے پیالے!

ہے رشک چمن شباب تیرا، یہ حسن ہے لاجواب تیرا،

آنکھوں میں ہو سیل نور جس سے رگ رگ میں ہو برق طور جس سے

روشن مری روح کو جو کر دے، جو مجھ میں تجلیات بھر دے

ایسا کوئی جلوہ کیا نہیں ہے،!

اے مطرب خوش ادا خوش آہنگ! دنیائے سرود ہے ترا چنگ

ہر تان میں ہے پیام عشرت ہر نغمہ ہے ایک جام عشرت

جو برق گرائے میرے دل پر برسائے جو آگ میری گل پر

آلایش روح کو جلا دے خاشاک خرد کو پھونک ڈالے

ایسا کوئی نغمہ کیا نہیں ہے،!

اے ساقی جام شادمانی، اک میکدہ ہے تیری جوانی،

ساغر میں ہے، شعلہ بار مستی، آنکھوں میں ہے صد ہزار مستی،

بخشے جو سرور و نور دل کو، کر دے جو ریاض طور دل کو
جس میں مری روح غرق ہو جائے سرمستی جاوداں میں کھو جائے،
ایسا کوئی جرعہ کیا نہیں ہے،!

کلامِ گویا

ازجناب گویا جہان آبادی،

یہ دل ہے کسی اور کا ممنونِ نگارش آئینہ میں، آئینہ کی تحریر نہیں ہے،
دل جس کے تصور میں رہا کرتے ہیں اکثر وہ خلق کی خود ساختہ تصویر نہیں ہے،
انسان ہے آئینۂ اسرارِ حقیقت قرآن کی بالرائے یہ تفسیر نہیں ہے،
کوشش کے موافق ہی ہر انسان بڑھیگا اندازۂ قدرت ہے یہ تقدیر نہیں ہے،
دنیا تو سمجھ لے تجھے مسجودِ ملائک خود تیری نظر میں، تری توقیر نہیں ہے،
تبدیل بھی دنیا کو کیا کرتے ہیں انسان ہو شوقِ طلب، ایک ہی تدبیر نہیں ہے،
کچھ اور ہی شے ہے جو ہلا دیتی ہے افلاک مسلم کی تڑپ نالۂ شبگیر نہیں ہے،
آزاد غلاموں کے یہ دل سے کوئی پوچھے پابند ہیں اور پاؤں میں زنجیر نہیں ہے،
گویا ہیں نگاہوں میں شاعروں کے معارف،
محتاجِ تعارف کوئی تدبیر نہیں ہے،

رباعی

ازحکیم الشعراء امجد حیدر آبادی،

بر چہرۂ خورشید سیاہی تا چند سلطانِ حقیقت بہ تباہی تا چند
جانم ہمہ تن، ز قیدِ تن تنگ آمد این مردہ بدوشِ من الٰہی تا چند

مطبوعاتِ جدیدہ

تفسیر سورۂ والعصر از مولینا حمید الدین فراہیؒ، تقطیع چھوٹی ضخامت ۶۶ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت :- ۶ر، پتہ دائرہ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح، سرائمیر اعظم گڈھ۔

سورۂ والعصر قصار جوامع الکلم میں ہے، یعنی ان سورتوں میں سے ہے، جو الفاظ کے اختصار کے باوجود معنی کی وسیع دنیا رکھتی ہیں، مولینا حمید الدین رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مخصوص انداز میں ان معانی کے رخ سے پردہ ہٹایا ہے، انھوں نے اسکی دو تاویلیں کی ہیں، ایک تاویل کی رو سے اس میں ان لوگوں کی حسرت و نامرادی بیان کیگئی ہے، جو غفلت اور سرمستی میں اپنی عمر گنواتے ہیں اور انھیں نیکی اور سچائی اختیار کرکے دولت جاودان حاصل کرنے کی تلقین کی گئی ہے، اس تاویل کو قبل وبعد کی سورتوں کے مضامین اور سورہ والعصر کے الفاظ و معنی سے دکھایا گیا ہے، اس بحث میں لفظ والعصر کی تحقیق اور اسکی روشنی میں زمانہ کی قسم کھانے کے اسرار ظاہر کئے گئے ہیں، اور غافل انسانوں کا خسران دکھایا گیا ہے، پھر لفظ "تواصوا" سے خلافتِ الٰہی کا ثبوت دیا گیا ہے، اور ایمان و عمل صالح اور تواصی بالحق پر جو دولتِ سرمدی، اور تمام دنیاوی اور اخروی بھلائیوں کا سرچشمہ ہے تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے، پھر صبر و حق کی حقیقت ظاہر کرکے ان کا باہمی تعلق دکھایا گیا ہے، دوسری تاویل اس سے زیادہ وسیع اور جامع ہے، اسکے لحاظ سے اس مختصر سورہ میں امت مسلمہ کے لئے دنیاوی، اخروی اور اجتماعی کامرانیوں کا دستور بیان کیا گیا ہے، اس بحث میں ایمان کی حقیقت بتا کر اس کے حقیقی اور سیاسی مفہوم کا حکیمانہ فرق دکھایا گیا ہے،

پھر عملِ صالح کی حقیقت ظاہر کر کے اسکے دنیوی اخروی اور اجتماعی کامرانیون کی بنیاد ہونے پر روشنی ڈالی گئی ہے، پھر حق و صبر کی لطیف تشریح اور ان کے باہمی تعلق اور عمل اور تواصی بالحق کے ربط کو دکھایا گیا ہے، آخر میں دعوت الی الحق کے فرض اور آزادی قول پر بحث ہے، اور ماقبل و بعد کی سورتون سے اس تاویل کی تائید و توضیح کی گئی ہے، ان تمام مباحث کا مدار آیاتِ قرآنی کلامِ عرب اور عقلی دلائل پر ہے، اور اس میں وہ تمام نکتہ آفرینیان ہیں، جو مصنف کا مخصوص حصہ ہین،

مضامین محمد علی، مرتبہ جناب محمد سرور صاحب بی اے استاذ جامعہ، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۹۵ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت مجلد: ؏، پتہ مکتبہ جامعہ دہلی، لاہور، لکھنو،

مولینا محمد علی مرحوم نے ملک و ملت کے صدہا مہماتِ مسائل پر مضامین لکھے ہین، ان مضامین کی علمی اور سیاسی قدر و قیمت کے متعلق کچھ لکھنا بے کار ہے، مولینا مرحوم کی شخصیت کی طرح جامعیت وہمہ گیری جرأت و صداقت، مذہب و قومیت کا صحیح اور معتدل امتزاج مذہب کا سچا ولولہ، ان مضامین کی بھی خصوصیت ہے، وہ مذہب و اخلاق، قومیت و وطنیت اور سیاست ملکی کا درس اور ہماری گذشتہ سیاست کی تاریخ ہین، اس لئے ضرورت تھی، کہ ان بیش قیمت مضامین کو اتلاف سے محفوظ کر دیا جائے، محمد سرور صاحب استاذ جامعہ شکریہ کے مستحق ہین کہ انھون نے قابلیت اور سلیقہ سے ان بکھرے ہوئے موتیوں کو پرو کر اس قومی فرضِ کفایہ کو ادا کیا، اس مجموعہ مین مختلف عنوانون کے ماتحت ہمدرد کے دوسرے دور ۲۴ء سے ۲۶ء تک کے ارسٹھ مضامین ہین یہ گویا اس دور کے ملکی اور ملی مسائل کی روداد اور مختلف واقعات و حوادث کی تاریخ ہے، اس میں علمی، مذہبی، تعلیمی، سیاسی اور وطنی مضامین، ذاتی حالات، دوسرون کے متعلق اظہارِ خیال وغیرہ مختلف موضوعون پر مولینا مرحوم کے خیالات ہیں، گو زمانہ کے لحاظ سے اب یہ داستانِ ماضی ہے، لیکن فائدہ کے لحاظ سے ان کی وہی تازگی ہے، افسوس ہے کہ پہلے دور

ہمدرد کے مضامین اس مجموعہ میں نہیں ہیں، امید ہے، کہ لائق مرتب انھین بھی تلاش کر کے اس سلسلہ کو مکمل کر دین گے، یہ مجموعہ ہندوستانیوں کے لئے عموماً اور مولینا مرحوم کے شیدائیوں کیلئے خصوصاً قابلِ قدر تحفہ ہے،

سیرۃ بتول:- مؤلفہ مولوی اعجاز الحق صاحب قدوسی، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۴۵ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت، بہتر، قیمت:- ۴ر، پتہ: سلیم اختر قدوسی، نامپلی جدید نمبر ۱۱/۷، لال ٹیکری حیدر آباد دکن،

دار المصنفین کے سلسلۂ سیر الصحابہ نے صحابہ اور صحابیات کی سیرت نگاری کی ایک عام شاہراہ کھول دی ہے، چنانچہ مولوی اعجاز الحق صاحب قدوسی اس سے پہلے اس موضوع پر بعض مفید کتابیں لکھ چکے ہین، سیرتِ بتول اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، اس میں معتبر کتابوں سے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے مختصر حالات، سادہ اور آسان زبان میں لکھے گئے ہین، مسلمان خواتین کیلئے حضرت فاطمہؓ کی زندگی نمونہ ہے، یہ کتاب بچیوں کو خاص طور سے پڑھانے کے لائق ہے،

من کی دنیا مصنفہ جناب رشید قرشی صاحب، تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۰۰ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت مجلد، عہر، پتہ:- ادارۂ ادبیات اردو حیدر آباد دکن،

یہ کتاب نوجوان مصنف کے بائیس مختصر افسانون کا مجموعہ ہے، ابھی ان کی ادبی مشق کا آغاز ہے، اسلئے تقریباً کل افسانے وارداتِ شباب کی تعبیرین ہیں، اور ان میں نومشقی نمایان ہے، تخیل اور انشا، دونون کی خامیان نظر آتی ہیں، لیکن ہونہار مصنف مین افسانہ نگاری کی صلاحیت موجود ہے، اگر مشق جاری رہی تو یہ ابتدائی خامیان دور ہو جائیں گی،

نصاب تعلیم بالغان، مرتبہ صاحبزادہ سعید الظفر خان صاحب قیمت ۹، پتہ مکتبہ جامعہ دہلی، لاہور، لکھنو،

آج کل کے تعلیمی مسائل میں تعلیم بالغان کا بھی ایک اہم مسئلہ ہے، متعدد ماہرین تعلیم نے اس کے عملی تجربات کرکے اس کے نتائج کے مطابق اس کا نصاب مرتب کیا، ان میں سے ایک یہ نصاب بھی ہے، اس میں پانچ کتابیں ہیں، اردو سکھانے کا آسان طریقہ، مدرس کا قاعدہ نمبر ۱، کا قاعدہ نمبر ۱ نمبر ۲ نمبر ۳ پہلی کتاب میں مولف نے اپنے عملی تجربات، طریقۂ تعلیم، اور اس کے نتائج لکھے ہیں، دوسرے میں اس طریقہ کے مطابق مدرسین کے لئے ہدایات ہیں اور اسکے اصول اور اس کی ترتیب بتائی ہے، باقی تینوں کتابیں، ان اصولوں کے مطابق ریڈر ہیں، تشریح کے لئے جابجا تصویریں بھی دیدی ہیں، ہم نے اس نصاب کو پڑھا، ہمارے خیال میں وہ بالغوں کی تعلیم کیلئے آسان اور مفید ہے،

اردو کے سو شعر، (چار حصے،) منتخبہ جناب محمود علی خان صاحب جامعی، تقطیع جیبی،

کتابت و طباعت بہتر قیمت ؟ پتہ مکتبہ جامعہ، دہلی،

محمود علی خانصاحب جامعی کے سو شعروں کے انتخاب کی جدت اتنی مقبول ہوئی کہ اس قسم کے بہت سے انتخابات شائع ہوئے، اب انھوں نے کسی خاص شاعر کے بجائے ہر دور کے ممتاز اساتذہ کے انتخابات شائع کئے ہیں، اور ولی دکنی سے لے کر موجودہ عہد تک چار دور قائم کئے ہیں، متقدمین متوسطین، متاخرین اور دور حاضر اور ان سب کے انتخابات علحدہ علحدہ ہیں، ہر حصہ کے شروع میں ایک مختصر نوٹ، اور آخر میں دو چار لفظوں میں اس حصہ کے شعراء کا تعارف ہے، انتخاب ایک ذوقی چیز ہے، ہر شخص کی پسند جداگانہ ہوتی ہے، تاہم انتخاب میں عموماً حسن مذاق سے کام لیا گیا ہے،

(م)

دار المصنفین کی نئی کتابین

تابعین رض

علم و عمل اور مذہب و اخلاق مین صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے سچے جانشین اور ان کے تربیت یافتہ تابعین کرام رضی اللہ عنہم تھے اور صحابۂ کرام کے بعد ان ہی کی زندگی مسلمانون کے لئے نمونۂ عمل ہے اس لئے سیر الصحابہ کی تکمیل کے بعد دار المصنفین نے اس مقدس گروہ کے حالات کا یہ تازہ مرقع مرتب کیا ہے، اس مین حضرت عمر بن عبد العزیز، حضرت حسن بصری، حضرت اویس قرنی، حضرت امام زین العابدین حضرت امام باقر، حضرت امام جعفر صادق، حضرت محمد بن حنفیہ، حضرت سعید بن مسیب، حضرت سعید بن جبیر، حضرت محمد بن سیرین، حضرت ابن شہاب زہری، امام ربیعہ رائی، امام مکحول شامی قاضی شریح وغیرہ چھیانوے اکابر تابعین کے سوانح ان کے علمی مذہبی، اخلاقی اور عملی مجاہدات اور کارنامون کی تفصیل ہے، مرتبۂ شاہ معین الدین احمد ندوی، ضخامت ۵۶۰ صفحے، قیمت: للعہ

مختصر تاریخ ہند

ہمارے اسکولون مین جو تاریخین پڑھائی جاتی ہین ان کا لب و لہجہ دلآزاری اور تعصب سے خالی نہین ہوتا، اور اس وجہ سے ہندوستان کی مختلف قومون مین تعصب اور بغض و عناد پیدا ہوجاتا ہے، مولانا ابو ظفر صاحب ندوی نے یہ تاریخ مدرسون اور طالب علمون کیلئے اس غرض سے لکھی ہے کہ اس کا طرز بیان قومی جذبات سے متاثر نہ ہو اور ہندو اور مسلمان فرمانرواؤن نے ہندوستان کے بنانے مین جو کام کئے ہین وہ طالب علمون کو بلا تفریق مذہب و ملت معلوم ہوجائین، ضخامت ۲۰۰ صفحے، قیمت: عہ